حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

شخصیت و حکمت کا ایک تعارف

محمد یٰسین مظہر صدیقی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ریسرچ سیل
ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

شخصیت و حکمت کا ایک تعارف

محمد یٰسین مظہر صدیقی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ریسرچ سیل

ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۲۰۰۲

یکے از مطبوعاتِ شاہ ولی اللہ دہلویؒ ریسرچ سیل-۲

تالیف : حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ- شخصیت و حکمت کا تعارف

مولف : محمد یٰسین مظہر صدیقی

صفحات : ۴۸

ناشر : شاہ ولی اللہ دہلویؒ ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مطبع : انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڑھ

کتابت : الائٹ کمپیوٹرز، ۶۴-احمد نگر، علی گڑھ

اشاعت : اول، فروری ۲۰۰۱ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۳۰ روپے

ملنے کے پتے: ☆ادارہ / شعبہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆پبلیکیشنز ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆ادارہ مطالعاتِ اسلامی، ۶۴-احمد نگر، علی گڑھ

☆مکتبہ ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، علی گڑھ

☆ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

☆مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

☆یونیورسل بک ہاؤس، عبد القادر مارکیٹ، علی گڑھ

فہرست

انتساب

فکرِ ولی اللّٰہی کے عاشقِ صادق

اور

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ریسرچ سیل کے معطی گرامی

ڈاکٹر صبیح احمد کمالی مرحوم کے نام

برلوحِ سینہ نامِ تو صد جا نوشتہ ایم

محمد یٰسین مظہر صدیقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسی عظیم شخصیت اور ان کی دقیق حکمت کا اجمالی تعارف کرانا خاصا مشکل کام ہے۔ مختصر نویسی میں لازمی طور سے کوئی نہ کوئی پہلو اوجھل رہ جاتا ہے۔ عبقری شخصیات کی سوانح اور افکار کا مفصل تجزیہ بھی مکمل نہیں ہوپاتا کیونکہ انسانی کاوشوں میں نقص کا رہ جانا فطری ہے۔ اس مشکل کا حل صرف یوں نکالا جاسکتا ہے کہ شخصیت کی بنیادی صفات اور اس کی فکر و حکمت کی نہادی جہات پر توجہ مرکوز رکھی جائے اور اس اجمالی تعارف میں ہم نے یہی کیا ہے۔

شخصیت و حکمتِ ولی اللٰہی کے اس تعارف کا مقصد عام قاری کو شاہ صاحبؒ کے سوانح، تصانیف اور افکار سے محض روشناس کرانا ہے، شاید اسے مفصل تصانیف کی طرف توجہ کرنے کی تحریک پیدا ہو۔ ۲۰-۲۲ر فروری ۲۰۰۱ء کو منعقد ہونے والے مجوزہ بین الاقوامی سیمینار کے شرکاء اور مندوبین کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک تعارفی کتابچہ کی ضرورت بھی اس کی تالیف کا ایک اور مقصد ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس اجمالی تعارف کو انگریزی، عربی، فارسی اور بعض دوسری زبانوں میں بھی پیش کیا جائے تاکہ ایک نظر میں شاہ صاحب کی شخصیت و حکمت سے آگاہی ہوسکے۔

اس کتابچہ میں فکرِ ولی اللٰہی کے بنیادی اور مستقل پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے اور ان کے بعض ثانوی افکار اور وقتی کارناموں سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ تجزیہ و تحلیل سے ضرور کام لیا گیا ہے مگر تنقید و تبصرہ سے عمداً گریز کیا گیا ہے کیونکہ قاری کو بنیادی نکات سے روشناس کرنا مقصود ہے جبکہ نقد و تجزیہ تحقیقی مقالات و کتب میں درکار ہوتا ہے۔

آخر میں مسلم یونیورسٹی کے علم پرور وائس چانسلر جناب محمد حامد انصاری صاحب مدظلہ کے فضل و کرم کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی کرم گستری سے ہی شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل کا قیام عمل میں آیا اور اسی کے تحت علمی کاموں کی بنا پڑی۔ ادارہ علومِ اسلامیہ کے تمام رفقاءِ کرام کے تعاون کا بالخصوص اور دوسرے اہلِ علم کی دستگیری کا بالعموم شکر گزار ہوں۔

۹ر جنوری ۲۰۰۱ء

محمد یٰسین مظہر صدیقی

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ الطاھرین
وأصحابہ المطھرین ومن تبعھم بأحسان الیٰ یوم الدین

حرف اول

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۴/ شوال ۱۱۱۴ھ / ۲۱/ فروری ۱۷۰۳ء-۲۹/ محرم ۱۱۷۶ھ / ۲۰/ اگست ۱۷۶۲ء) عظیم ترین اسلامی مفکروں میں بھی اعلیٰ مقام ومرتبہ کے حامل ہیں اور برِ صغیر کی ملتِ اسلامی کے بلاشبہ جلیل ترین عالم اور عبقری مفکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نادر لیاقتوں سے نوازا اور بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کیا تھا۔ ذہن ودماغ کی اعلیٰ قوتوں کے ساتھ ساتھ قلب و روح کی نفاستوں اور طہارتوں کے ساتھ ان کو سجایا اور سنوارا تھا۔ تجر علمی اور تفکرِ وجدانی کے وہ مجمع البحرین تھے۔ اس سے زیادہ ان کی عظیم خاصیت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے علوم وفنون اور ادراک ووجدان کو اظہار وابلاغ کی دلنشیں زبان عطا کی اور اپنی تالیفات واکتشافات اور عملی مجاہدات کے ذریعہ امتِ اسلامی کی تعلیم وتربیت اور رہنمائی وقیادت کی۔ کوئی تسلیم کرے نہ کرے، ان کے کارنامے مجددانہ تھے اور وہ خود مجددِ وقت۔

عظیم وجلیل اور عبقری شخصیات کے ظہور وعمل کے باب میں عام اہلِ قلم اور صاحبانِ تبصرہ کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ علمی کساد بازاری، دینی زبوں حالی، اخلاقی افراتفری اور تہذیبی بدحالی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ یہ خیال خام اور منافئ فطرت ہے۔ انبیاء ومرسلین کے عظیم ترین انسانی طبقات سنتِ الٰہی کے مطابق تدریجی ارتقاء کے ان گنت ادوار سے گذرے تب جاکر تکمیلِ نبوت اور اتمامِ شریعت کا آخری دور آیا جو حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی ﷺ کے ختم المرسلین اور دینِ اسلام کے خاتمِ شریعت ہونے کی صورت میں ظہور پذیر وعروج پذیر ہوا۔ علمی ودینی عبقریات کے ظہور وعمل کے پیچھے اسی قانونِ قدرت کے مطابق قرنوں کی انسانی فکر، علمی وفنی میراث اور دینی حکمت وفلسفہ کا پشتہ لگا ہوتا ہے۔ وہ صدیوں کے علمی ودینی ورثہ کی زائیدہ اور اپنے عہد میں ان کی امین ہوتی ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کا بارہویں / اٹھارویں صدی میں ظہور، ان کے علمی کارنامے، ان

کے فکری عطایا، اسلامی فکر و علم کے خزینہ میں ان کی حصہ داری اور اسلام و علم کی تجدیدی خدمت اسی مسلسل و متواتر اسلامی میراث کا ایک عظیم ترین ثمرہ ہے جس کے پروان چڑھانے اور روبہ عمل لانے میں ان کے خاندان، والدین، اساتذہ، تعلیم و تربیت، ماحول و فضا اور زمان و مکان کے بعض دوسرے فوری محرکات، اسباب اور عوامل کا ہاتھ بھی تھا۔ اور ان سب پر مستزاد، ان کے اپنے دل و دماغ کے تقاضے جو انھیں اظہار و عمل کے لئے بے تاب رکھتے تھے۔

شخصیت

خاندانِ ذی شان

خون کے رشتے سے بھی وہ مجمع البحرین تھے۔ پدری جانب سے وہ فاروقی تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمر فاروقؓ کے واسطہ سے ان کا نسب خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب عدویؓ سے جاملتا ہے اور مادری لحاظ سے ہاشمی علوی تھے کہ حضرت موسیٰ کاظم کے واسطہ سے ان کا رشتہ خاندان خلیفۂ چہارم حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی سے جا متصل ہوتا ہے۔ قبیلۂ رسالت - قریش - کے ان دونوں عظیم ترین خاندانوں اور رسولِ اکرم ﷺ سے ان کی عظیم و کریم نسبت کے اثرات شاہ ولی اللہ دہلوی کے رگ و پے میں خاندانی طور سے موجود تھے اور ان کی پرورش و پرداخت ان کی فکری و ذہنی کار آفرینی نے مزید کی تھی۔ (انفاس العارفین، اردو ترجمہ ۳۳۱)

کسی نامعلوم تاریخی موڑ پر شاہ ولی اللہ کا خاندان مدینۂ منورہ یا مرکزِ عرب سے یمن منتقل ہوا اور وہاں سے منگول رستاخیزی کے دور میں ہندوستان کی مہاجرت پر مجبور ہوا۔ ان کے اجداد و اسلاف کے سلطنتِ دہلی (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے اولین دور - تیرھویں صدی عیسوی - میں واردِ ہند ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ مختلف بلاد و امصار میں سکونت پذیر ہوتے رہے تا آنکہ تیرھویں پیڑھی کے جدِ امجد مفتی شمس الدین ہریانہ کے قصبہ رہتک میں دہلی سلاطین کے آخری دور میں آباد ہوئے۔ وہ علم و تقویٰ کے پیکر تھے لہذا علاقہ کے قاضی بنے اور ان کے اخلاف و خاندان میں پھر منصبِ افتاء و قضا موروثی بن گیا جو تقریباً چار سو سال جاری رہا۔ (انفاس العارفین ۳-۳۳۱ومابعد)

مادری خاندان کے اسلاف بھی ہجرت کر کے خاکِ ہند کے باسی بنے۔ وہ بھی علمی میراث کے امین اور تقویٰ و طہارت کے پیکر تھے لیکن وہ سرکاری مناصب اور حکومتی مشاغل سے دور

مدرسوں اور خانقاہوں میں تعلیم و تزکیہ کے چراغ جلاتے اور رشد و ہدایت کے انوار پھیلاتے رہے۔ شاہ ولی اللہ کے دادا شیخ وجیہ الدین کے خسر شیخ رفیع الدین محمد ایک عظیم عالم و صوفی تھے۔ وہ خانقاہ کے سجادہ نشین بھی تھے جو ان کے والدِ ماجد شیخ قطب العالم سے وراثت میں ملی تھی۔ عظیم شیخ وقت اور امامِ نقشبندیہ حضرت خواجہ باقی باللہ (ذوالحجہ ۹۷۱ھ / جولائی ۱۰۶۴--۲۵ر جمادی الثانیہ ۱۰۱۲ھ / ۲۰ر جولائی ۱۶۰۵ء) نے ان کی خانقاہ میں تعلیم و تربیت پانے کے بعد ان کے مشورہ پر نقشبندیہ طریقہ کے عظیم ترین شیخِ وقت خواجہ محمد امکنگی کے پاس تکمیلِ معرفت کرنے بخارا گئے تھے۔ قطب العالم کے اجدادِ پدری - والدِ ماجد شیخ عبد العزیز شکر بار (م ۶-۹۷۵ھ / ۶۹-۱۵۶۸ء)، دادا شیخ محمد خیالی، پردادا شیخ حسن، نگر دادا شیخ طاہر اوچھی - سب کے سب عظیم علماء اور صاحبِ کمالاتِ صوفیہ، صحیح الحال، پاکیزہ مشرب، قوی الریاضت، زاہدِ مرتاض اور صاحبانِ مقام تھے۔ (انفاس العارفین، ۵۷-۳۴۷)

شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین فاروقی آرزوے شہادت میں مغل افواج سے وابستہ ہوئے اور جلد ہی ان کی تمنا بر آئی۔ وہ مالوہ کے قصبہ ہنڈیا میں ایک معرکۂ حق و باطل میں شہادت کو پہونچے اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ شیخ رفیع الدین محمد علوی کی دختر سے ان کے تین فرزند ہوئے تھے: فرزندِ اکبر شیخ ابو الرضا محمد (م ۱۷ر محرم ۱۱۰۱ھ / ۲۱ر اکتوبر ۱۶۹۰ء) تھے، دوسرے شیخ عبد الرحیم والدِ ماجد شاہ صاحب تھے اور تیسرے شیخ عبد الحکیم تھے۔ (انفاس العارفین، ۳۶-۳۳۸)

حضرت شاہ کے والدِ ماجد شیخ عبد الرحیم کی شادی شیخ محمد پھلتی (م ۸ر جمادی الاولیٰ ۱۱۲۵ھ / ۲ر جون ۱۷۱۳ء) کی دختر فخر النساء سے ہوئی تھی۔ ان کے آباء و اجداد پہلے پہل پورب کے شہر کے باسی بنے جہاں وہ تعلیم و تزکیہ کا کام کرتے رہے۔ ایک جدِ امجد شیخ احمد بن یوسف سلطان سکندر لودھی کے معاصر اور ان کے دربار سے علمی طور سے وابستہ تھے۔ پھلت ضلع مظفر نگر (سہارنپور) سمیت ان کو بطور مددِ معاش چند گاؤوں سرکار سے ملے۔ پھلت ان کا آبائی وجدی وطن بن گیا۔ یہ اہلِ علم و صاحبانِ معرفت تھے۔ شیخ احمد کے ایک بھائی شیخ محمود تھے جو شاہ صاحب کے مادری خاندان کے اس دور کے جدِ امجد تھے۔ ان کے دو فرزندوں میں ایک شیخ فرید تھے جن کے متعدد فرزندوں میں شیخ ابو الفتح براہ راست جدِ مادری تھے۔ ان کے بیٹے شیخ ابو الفضل اور پوتے شیخ ابو الکرم تھے۔ یہی شیخ ابو الکرم شیخ محمد پھلتی کے والدِ ماجد تھے۔ وہ صاحبِ علم و تقویٰ، پاکیزہ مشرب اور عظیم شخص تھے۔ (انفاس العارفین، ۷۳-۳۵۸)

والدِ ماجد: شیخ عبد الرحیم فاروقی (۱۰۵۴ھ / ۴۵-۱۶۴۴ء -- ۱۲ر صفر ۱۱۳۱ھ / ۴ر جنوری ۱۷۱۹ء) اپنے پدری اور مادری اسلاف کے وارث و جانشین ہونے کے علاوہ وقت کے عظیم ترین علماء اور جلیل ترین صوفیہ میں شمار ہوتے تھے۔ والدِ ماجد کی اچانک شہادت کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کا فریضہ برادرِ بزرگ شیخ ابو الرضا محمد نے انجام دیا۔ ان کے اساتذہ میں میر زاہد ہروی (م ۱۱۰۱ھ / ۱۶۹۰ء) خواجہ باقی باللہ نقشبندی کے فرزند خواجہ خورد، حافظ سید عبد اللہ اکبر آبادی خلیفۂ شیخ آدم بنوری و مجازِ شیخ ادریس قادری سامانی اور خلیفہ ابو القاسم علائی (م ۱۰۸۹ھ / ۱۶۷۸ء) وغیرہ سے کسبِ فیض اور اخذِ علمِ لدنی کیا۔ تعلیم و تربیت کے فیضان کو اکتساب و اعمال سے جلادی۔ اور وقت کے عظیم ترین فقہاء و علماء میں ممتاز مقام بنالیا۔ اسی بنا پر شہنشاہِ وقت محی الدین اورنگزیب عالمگیر (۱۶۵۹ء تا ۱۷۰۷ء) نے مشہورِ زمانہ اور عظیم ترین کتابِ فقہ - فتاوائے عالمگیری - کی تدوین کرنے والے علماءِ کرام کی جماعت کا رکنِ رکین بنادیا، اگرچہ بعد میں اس کارِ خیر سے سبکدوشی مل گئی تاہم ان کے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کا ایک زمانہ معترف رہا۔

مدرسۂ رحیمیہ دہلی

شاہ عبد الرحیم کا اصل کارنامہ مدرسۂ رحیمیہ کا قیام، مخصوص نصابِ تعلیم کا اجراء اور ممتاز نظامِ تربیت کا نفاذ تھا۔ مسجدِ فیروز شاہ کوٹلہ کے قریب ایک عمارت میں قائم اس مدرسہ میں استاذ الاساتذہ اور شیخ المشائخ شاہ عبد الرحیم نے تعلیم و تدریس کی اساس متنِ قرآنِ کریم پر رکھی تھی۔ عربی زبان و قواعد کی ضروری تعلیم کے بعد وہ اپنے تلامذہ کو سورت بہ سورت اور آیت بہ آیت قرآنِ کریم کا متن پڑھاتے تھے اور اسی کو اصل دینی تعلیم قرار دیتے تھے۔ متنِ قرانی کی تدریس کو تفسیر و تشریح اور تاویلِ مفسرین سے آلودہ نہیں کرتے تھے۔ حدیث کی بنیادی کتابیں، ادب و فن کے ضروری شہ پارے اور حکمت و منطق اور فلسفہ کی چند کتابیں ان کے سوانصابِ رحیمیہ کے اجزاء تھے۔ اسی کے ساتھ وہ لازمی طور سے تصوف کے فکر و فلسفہ کی تعلیم کا اہتمام کرتے اور علمی تربیت کے سخت مراحل سے گذارتے تھے۔ وہ نقشبندی، قادری، چشتی، سہروردی، شطاری اور بعض دوسرے سلاسل کے اشغال و اعمال سے آراستہ کرتے، بیعت کرتے اور تزکیہ کرتے تھے۔ وہ فلسفہ وحدۃ الوجود کے قائل، معلم و مفسر تھے اور تمام افکارِ طریقت و معرفت کے ماہر پارکھ - بایں ہمہ کتاب و سنت کی

بالادستی کے قائل وعامل۔

علوم وفنون میں تبحر اور طریقت و معرفت میں کمال رکھنے کے باوجود وہ ایک شفیق باپ، صاحبِ دل استاذ، گداز قلب شیخ اور حلیم و کریم مربی تھے۔اعلیٰ اخلاق کے مالک، پسندیدہ صفات کے حامل، دل موہ لینے والے اور قلوب واذہان پر چھاجانے والی شخصیت تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت وتراش وخراش ایسے ہی کارساز ہاتھوں اور شخصیت ساز صلاحیتوں والے عبقری کے ذریعہ ہوئی تھی۔ (انفاس العارفین ۱۹۰-۲۵ مع تذکرہ اساتذہ وشیوخ، کرامات وملفوظات)۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ تجزیۂ شاہ بالکل صحیح ہے کہ "شاہ ولی اللہ صاحب کی فکری تربیت اور ان کی علمی اساس میں ہم ان کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کو اصل مانتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے خود اپنے نامور صاحبزادے کو تعلیم دی تھی...... الغرض یہ تین چیزیں یعنی قرآن کے متن کو اصل جاننا، وحدۃ الوجود کا صحیح حل اور اسلامی علوم میں حکمتِ عملی کی غیر معمولی اہمیت، شاہ ولی اللہ کے علوم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ تینوں کی تینوں شاہ عبدالرحیم صاحب کی تربیت کا نتیجہ ہیں......" (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ۷۵-۷۴)

ولادت وتسمیہ

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ "میری ولادت بروز بدھ ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ بوقتِ طلوعِ شمس ہوئی" (انفاس العارفین ۴-۴۰۳)۔ ملفوظاتِ عزیزی اور دوسرے تمام سوانح نگاروں نے بھی اس کی تائید کی ہے (برکاتی، ۱۰؛ محمد فاروق قادری ۱؛ جلبانی ۱۹، بلجان، ۱؛ فاروقی، ۳-۷۲)۔ اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ شاہ صاحب اپنی ننہال پھلت میں پیدا ہوئے تھے (مذکورہ بالا) بقول بلجان مسلم دینی حلقوں میں عظیم شخصیات بغیر کسی پیشگوئی کے نہیں پیدا ہوتیں کیونکہ شاہ صاحب نے اپنی ولادت کے بارے میں چند پیشگوئیوں کا ذکر کیا ہے (بلجان: انفاس ۴۰۴)

ان کی اپنی تصریح ہے کہ اصل نام نامی احمد تھا اور غالباً شیخ احمد سرہندی مجددِالفِ ثانی (۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء-۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) کے نام پر، جن سے والدِ ماجد شیخ عبدالرحیم بہت متاثر تھے۔رویاء میں شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی ہدایت وعقیدت کی بناپر بعد میں قطب الدین لقب پڑا۔ معین الدین، فریدالدین، نظام الدین وغیرہ صوفیہ میں، شمس الدین، جلال الدین، محی الدین

سلاطین میں اور بدرالدین، جلال الدین، تاج الدین علماء میں "الدین" کے لاحقہ کے ساتھ القاب رکھنے کا رواج قرونِ وسطیٰ میں عام تھا۔ مگر حضرت شاہ صاحب "ولی اللہ" کے اہم اور معتبر لقب و خطاب سے زیادہ معروف ہوئے۔ جو اصل نامِ سامی بن گیا اور زبان زدِ خاص و عام ہوا۔ تاریخی نام "عظیم الدین" ہے جس سے ۱۱۱۵ھ کا سنہ برآمد ہوتا ہے۔ (انفاس ۴۰۳)

تعلیم و تربیت

ابتدائی ماہ و سال اور مراسمِ ولادت و تربیت کے بعد شاہ ولی اللہ پھلت سے اپنے والدِ ماجد کے زیرِ تربیت آگئے اور دہلی میں زیادہ تر مقیم و زیرِ تعلیم رہے۔ شاہ صاحب نے اپنی تعلیم و تربیت کا خاصا مفصل حال اپنی خود نوشت میں لکھا ہے: "...... پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھا اور سات سال کا تھا کہ والدِ بزرگوار نے مجھے نماز کے لئے کھڑا کر دیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ ختنہ بھی اسی سال ہوا...... میں نے قرآنِ مجید بھی اسی سال ختم کر کے عربی فارسی کتابیں شروع کیں۔ دس برس کا تھا تو شرح ملا پڑھتا تھا۔ اسی دوران مجھ پر مطالعہ کی راہ کھلی...... پندرہ برس کی عمر میں والدِ بزرگوار سے بیعت کر کے اشغالِ صوفیا خصوصاً مشائخِ نقشبند کے اشغال میں مصروف ہو گیا...... ان سے آدابِ طریقت کی تعلیم اور خرقہ صوفیاء حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کر لیا۔ اسی سال بیضاوی شریف کا کچھ حصہ پڑھا...... خلاصہ یہ کہ اس علاقے کے تمام علومِ متداولہ سے پندرہ برس کی عمر میں فراغت حاصل کر لی۔ میں نے جملہ علوم کی کتابیں ذیل کی ترتیب کے مطابق پڑھیں: علم حدیث میں کتاب البیع سے کتاب الآداب کا حصہ چھوڑ کر باقی مکمل مشکوٰۃ، صحیح بخاری کتاب الطہارۃ تک، شمائل النبی ﷺ مکمل...... تفسیر میں بیضاوی و مدارک کے کچھ حصے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے مجھ پر ایک احسان یہ ہے کہ چند مرتبہ والدِ بزرگوار سے مدرسے میں قرآنِ عظیم کے معنی، شانِ نزول و کتبِ تفاسیر میں رجوع کرتے ہوئے کلامِ قدسی میں تدبر حاصل کرنے کا موقعہ ملا جو میرے لئے ایک عظیم فتح تھی...... فقہ میں شرحِ وقایہ اور ہدایہ کا اکثر حصہ، اصولِ فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کچھ حصہ، منطق میں شرحِ شمسیہ مکمل اور شرحِ مطالع کا کچھ حصہ، کلام میں شرحِ عقائد مکمل اور خیالی و شرحِ مواقف کے کچھ حصے، سلوک میں عوارف المعارف کا کچھ حصہ اور رسائلِ نقشبندیہ وغیرہ، حقائق میں شرحِ رباعیاتِ مولانا جامی، مقدمۂ شرحِ لمعات اور نقد النصوص، خواص و اسماءِ آیات میں والدِ بزرگوار کا خاص مجموعہ...... طب میں

موجز القانون، حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ، نحو میں کافیہ اور اس پر شرحِ ملا، معانی میں مطول کا اکثر حصہ اور مختصر معانی کا وہ حصہ جس پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے اور ہندسہ و حساب میں بعض مختصر رسائل۔ اس حصولِ علم کے دوران ہر فن کے کئی قیمتی نکات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے جو مزید غور و فکر سے کئی اور راہیں سجھا دیتے۔ میں اپنی عمر کے سترھویں برس میں تھا کہ والدِ بزرگوار بیمار پڑ گئے...... مرض الموت کے دوران مجھے بیعت و ارشاد کی اجازت عطا فرمائی......" (انفاس العارفین ۵-۴۰۴)

والدِ ماجد شیخ عبد الرحیم کے علاوہ شاہ ولی اللہ کے کئی دوسرے ابتدائی اساتذہ تھے۔ شیخ محمد فاضل سندھی (م ۱۷۳۲ء) سے متنِ قرآن اور شیخ محمد افضل سیالکوٹی (م ۱۷۴۴ء) سے حدیث کا درس لیا۔ تصوف میں والدِ ماجد سے قادری چشتی طُرق کے علاوہ نقشبندی تربیت حاصل کی۔ مزید تربیت مجددِ الفِ ثانی کے شیخ خواجہ باقی باللہ کے فرزندِ گرامی خواجہ خورد سے پائی۔

تدریس و تربیت

"والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد کم و بیش بارہ برس تک دینی اور عقلی کتابوں کی تدریس میں مشغول رہا اور ہر علم میں خاصا درک حاصل ہوا۔ جب میں والدِ گرامی کے مزار پر مراقبہ کرتا تو مسائلِ توحید حل ہو جاتے، جذب کا راستہ کھل جاتا، سلوک میں سے وافر حصہ میسر آتا اور وجدانی علوم کا ذہن میں ہجوم لگ جاتا، مذاہبِ اربعہ اور ان کے اصولِ فقہ کی کتابوں اور ان احادیث، جن سے وہ استدلال کرتے ہیں، کے مطالعے کے بعد مجھے نورِ بصیرت سے معلوم ہوا کہ فقہائے محدثین کی روش ہی اختیار کی جائے......" (انفاس ۴۰۶)

قیامِ حرمینِ شریفین (اپریل ۱۷۳۱ء - جون ۱۷۳۲ء)

"اس بارہ سال کے عرصے کے بعد میرے سر میں حرمینِ شریفین کی زیارت کا سودا سمایا۔ ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں حج کی سعادت سے مشرف ہوا اور ۱۱۴۴ھ میں مجاورتِ مکہ مکرمہ، زیارتِ مدینہ منورہ، شیخ ابو طاہر قدس سرہ اور دوسرے مشائخ حرمین سے روایتِ حدیث کا شرف حاصل کیا۔ اسی دوران حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوات واتم التحیات کے روضۂ اقدس کو مرکزِ توجہ بنا کر فیوض حاصل کیے۔ علمائے حرمین اور دیگر لوگوں کے ساتھ دلچسپ صحبتیں رہیں اور شیخ

ابو طاہر سے خرقۂ جامعہ حاصل کیا جو بلاشبہ تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع ہے۔ اسی سال کے آخر میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ۱۱۴۵ھ میں عازمِ وطن ہوا اور اسی سال بروزِ جمعہ ۱۴ رجب المرجب صحیح و سالم وطن پہنچ گیا......" (انفاس ۲۰۶)

شاہ عبدالعزیزؒ کے مطابق حضرت شاہ نے حرمینِ شریفین میں کل چودہ ماہ قیام فرمایا جب کہ تقریباً ایک سال کی مدت آمد و رفت کے سفروں میں لگ گئی۔ شاہ ولی اللہ نے دو حج ادا کرنے اور روضۂ اطہر پر مراقبہ کرنے کے ساتھ علوم و معارف کی تکمیل کی جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" میں کیا ہے۔ وہ رسالہ بھی انفاس العارفین میں شامل ہے (۲۷۴-۳-۲۰۲)۔ اس کے مطابق حضرت شاہ صاحب نے تحصیلِ حدیث و معارفِ حدیث میں زیادہ وقت لگایا اور کامل توجہ صرف کی۔ مکہ مکرمہ میں مالکی شیخ محمد وفد اللہ سے امام مالک بن انس کی مکمل "موطا" بروایتِ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی (م ۸۴۸ھ) کا درس لیا۔ حدیث کے مکی استاذِ گرامی ایک حنفی عالم شیخ تاج الدین قلعی (م ۱۷۳۴ء) مفتی مکہ مکرمہ تھے۔ لیکن ان کے سب سے بڑے استاذِ حدیث و طریقت بلکہ معلم و مربی شافعی عالم شیخ ابو طاہر محمد کردی (م ۱۷۳۳ء) تھے جن کے والدِ ماجد شیخ ابراہیم کورانی (م ۱۶۹۰ء) بھی عظیم عالمِ حدیث تھے۔ شیخ کردی سے شاہ صاحب نے کامل صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتبِ حدیث کے منتخب حصے پڑھے۔ مزید بر آں کتبِ تصوف کا بھی درس لیا۔ ان میں امام شاذلی (م ۱۲۵۸ء) کی "حزب البحر" اور امام ابو طالب مکی (م ۹۹۶ء) کی "قوت القلوب" شامل تھیں۔ ان سے شاذلی طریقت اور شطاری طریقہ بھی حاصل کیا اور سید علی ہمدانی کے ذریعہ کبرویہ طریقت میں بھی تربیت پائی۔

حرمین سے واپسی اور تدریس

جون ۱۷۳۲ء میں حرمین سے واپسی ہوئی اور مدرسۂ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ ازسرِ نو شروع کر دیا۔ "شان و شوکت سے ایک زمانہ تک علمِ حدیث کی درس و تدریس کرتے رہے اور اس کاوش و محویت کے ساتھ کہ ہر دن کے بہت تھوڑے حصہ میں وعظ و افتاء اور فصلِ خصومات میں مصروف رہتے اور باقی اوقات درسِ طلبہ اور تکمیلِ تلامذہ میں صرف کرتے......" (حیات ولی ۴۷۹) حرمینِ شریفین کے قیام کے دوران حضرت شاہ پر دوسرے علوم و فنون کے علاوہ علمِ حدیث کا غلبہ ہو گیا تھا جس کا اظہار ملفوظاتِ عزیزی میں یوں ملتا ہے: "میرے والد نے مدینۂ

منورہ سے رخصت کے وقت اپنے استاد سے عرض کیا جس سے وہ خوش ہوئے کہ میں نے علمِ دین یعنی حدیث کے علاوہ جو کچھ پڑھا تھا اسے بھلا دیا"۔ (برکاتی، ۱۱) لیکن اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں نکالنا چاہئے کہ شاہ صاحب نے دوسرے تمام علوم وفنون کی بساط پوری کی پوری لپیٹ دی تھی کیونکہ ان کی بعد کی تصانیف سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

اپنے آخری تیس برسوں میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے عمومی درس و تدریس کا سلسلہ آہستہ آہستہ بند کر دیا اور صرف منتہی طلبہ کو مدرسۂ رحیمیہ میں درسِ حدیث دیتے اور بعض اہم علوم وفنون پڑھاتے رہے اور طریقت وسلوک کی تربیت دیتے رہے۔ اس زمانے میں ان کا زیادہ زور "کردار سازی اور شخصیت نوازی" پر رہا۔ "حضرت والدِ ماجد نے ہر ایک فن کے لئے ایک شخص کو تیار کر دیا تھا اور ہر فن کے طالب علم کو اس کے (فاضل کے) سپرد کر دیتے تھے اور حقائق و معارف بیان اور تحریر کرنے میں مشغول رہتے تھے اور حدیث کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ مراقبہ کے بعد جو کشف ہوتا تھا اس کو لکھ لیتے تھے۔...... دیگر علوم و کمالات کے علاوہ ضبطِ اوقات میں بھی والدِ ماجد کی طرح کم ہی کوئی آدمی نظر آیا۔ اشراق کے بعد جو بیٹھتے تھے تو پہلو بھی نہ بدلتے تھے، کھجاتے تھے، نہ تھوکتے تھے...... بیمار بھی کم ہوتے تھے...... " درس وغیرہ میں والدِ ماجد کی تحریر و تقریر اکثر رقص آور، لذت بخش و لطف انگیز ہوتی تھی (برکاتی، ۱۳-۱۲) ہمارے خاندان میں طب کا بھی مشغلہ رہا چنانچہ جدِ بزرگوار (شاہ عبد الرحیم) اور عمِ فقیر (شاہ اہل اللہ) مطب کرتے تھے۔ والدِ ماجد اور میں نے یہ سلسلہ موقوف کیا...... والدِ ماجد نے کسی مصلحت سے علاج اور مطب کرنے سے روک دیا تھا......" (برکاتی، ۱۴)

اگرچہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے درس و تدریس کا کام بہت محدود و مختصر کر دیا تھا تاہم یہ عجیب و غریب حقیقت ہے کہ سفر حرمینِ شریفین کے بعد ان کے تلامذہ کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ زیارتِ مقدسہ کے بعد ان کی مہارتِ حدیث اور تبحر علمی کی شہرت زیادہ وسیع و عالمگیر ہوئی تھی۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "موطا امام مالکؒ کی تدریسِ خاص اور فنِ تدریس کے نئے طریقوں کی ایجاد نے بھی تلامذہ کو کھینچا ہو کیونکہ ہندوستان میں اس وقت تک "موطاؒ کی تدریس صفر کے برابر تھی اور طریقۂ تعلیم بھی روایتی تھا۔ تعمیر شخصیت، تربیتِ نفس اور تزکیۂ روح بھی بہت سے قلوب وارواح کے لئے باعثِ کشش رہی ہوگی۔

تلامذہ

بطور استاد کسی کے مقام و مرتبہ اور بلند پایہ ہونے کا اندازہ اس کے شاگردوں کی کثرت سے لگایا جاتا ہے اور اس سے زیادہ شاگردانِ رشید کی علمی جلالت، تصنیفی لیاقت اور تدریسی وسعت سے قائم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے تلامذہ کے جمِ غفیر میں بہت سے صاحبانِ جلالت و عظمت بھی ہو گذرے ہیں۔ عرب دنیا میں سب سے زیادہ شہرت محمد مرتضیٰ زبیدی (۹۱-۱۷۳۲ء) مولفِ "تاج العروس" کی ہے جو فیروز آبادی کی "القاموس المحیط" کی توسیع ہے۔ وہ "اتحاف السادۃ المتقین"، جیسی عظیم و جلیل کتاب کے مولف بھی تھے جو امام غزالی کی "احیاء علوم الدین" کی شرح ہے۔ انھوں نے شاہ ولی اللہؒ کی خدمت میں مدتوں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔

شاہ صاحب کے دوسرے عظیم اور صاحبِ لیاقت شاگردِ رشید قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۸۱۰-۱۷۲۵ء) تھے۔ وہ اٹھارہ سال کے تھے جب درسِ حدیث کے لئے خدمتِ ولی اللّٰہی میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے اپنے عظیم استاد کے "وصیت نامہ" کے بعض اجزا مرتب کئے تھے۔ دوسرے تلامذہ میں بہت سے نامور اشخاص و اعلام شامل ہیں: شیخ ابراہیم آفندی، امین اللہ نگر نہوی، شیخ بدر الحق پھلتی، شاہ جار اللہ بن عبد الرحیم لاہوری، سید جمال الدین رامپوری (م ۱۸۲۵ء)، شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلوی (م ۱۹ر ستمبر ۱۷۷۹ء)، شاہ محمد نعمان رائے بریلوی عمِ سید احمد شہید (م ۱۷۷۹ء)، مولانا خیر الدین سورتی، مرزا رستم علی بیگ، سید شرف الدین، حافظ عبد الرحمٰن ٹھٹوی، حافظ عبد النبی، شیخ عبد الہادی سودھروی، نواب رفیع الدین مراد آبادی فاروقی (م ۱۸۰۸ء)، فضل اللہ کشمیری، خواجہ محمد امین کشمیری (م ۱۷۷۳ء)، شیخ محمد بن ابی الفتح بلگرامی اور متعدد دوسرے۔

شاہ صاحب کے حقیقی برادرِ خورد شاہ اہل اللہ دہلوی (۸۶-۱۱۱۹ھ / ۷۲-۱۷۰۸ء) بھی ان کے شاگردِ خاص رہے تھے۔ والدِ ماجد شیخ عبد الرحیم کی وفات کے وقت بارہ سال کے نوخیز نوجوان تھے۔ شاہ عبد الرحیم سے بیعت و تربیت کے باوجود ان کی اصل تعلیم برادرِ بزرگ کے ہاتھوں سے ہوئی۔ جب شاہ ولی اللہ دہلوی زیارتِ حرمین کے مقدس سفر پر گئے تو اپنے انھیں بھائی کو مدرسۂ رحیمیہ کا سربراہ اور اپنے والدِ ماجد کے سجادہ کا جانشین بنایا تھا۔ پھلت ان کا مولد و موطن تھا اور آخیر میں دہلی کی سکونت ترک کر کے پھلت ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ وہ بھی ذی علم، باکمال اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ ان کی تالیفات میں "انفاسِ رحیمیہ" (مجموعۂ مکاتیب)، "تخریجِ احادیث

ہدایہ"، "تلخیصِ ہدایہ، اصولِ فقہ پر ایک رسالہ، "تفسیر قرآن، فارسی ترجمہ کنز الدقائق"، "رسالہ چہار باب"، فارسی ترجمہ "موجز القانون" اور "رسالہ فوائد" شامل ہیں۔ وہ سب کے سب مخطوطات ہی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خلیفۂ اعظم اور عزیز ترین شاگرد اور محبوب ترین دوست شاہ محمد عاشق پھلتی (م ۱۱۸۷ھ) تھے۔ وہ شاہ صاحب سے متعدد نسبی اور قرابتی رشتے رکھنے کے علاوہ ان کے ہمدرس، شاگرد، مرید، خلیفہ اور جانشین تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے خسر شیخ عبید اللہ کے فرزند تھے جبکہ ان کے دادا شاہ محمد پھلتی شاہ عبد الرحیم کے خسر تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سفرِ حرمینِ شریفین میں اپنے والدِ ماجد کے ساتھ شریک رہے تھے۔ شیخ ابو طاہر کردی سے ان دونوں باپ بیٹے نے بھی درسِ حدیث کا اجازہ لیا تھا۔ بعد میں دہلی سے ترکِ سکونت کر کے پھلت جا بسے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف "القول الجلی فی ذکر آثار الولی" ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی حیات ہی میں ان کے سوانح و ملفوظات سے متعلق مرتب کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری کتب میں شامل ہیں: شاہ ولی اللہ کی "الخیر الکثیر" پر حاشیہ، "شرح دعاء الاعتصام"، "سبیل الرشاد"، "مکتوبات شاہ ولی اللہ"، "المصفّٰی فارسی شرحِ "موطا کی تدوین جو شاہ صاحب کی وفات کے بعد انھوں نے کی تھی۔

تلامذہ میں سب سے زیادہ ولی اللّٰہی معارف اور علوم و فنون کے وارثین تو حضرت شاہ کے چار فرزندانِ گرامی ہیں جو حضرت شاہ کی دوسری بیوی بی بی ارادت بنت سید ثناء اللہ ہاشمی کے بطن سے تھے۔ شاہ صاحب کی پہلی زوجہ لمۃ الرحیم ان کے ماموں شاہ عبید اللہ کی صاحبزادی تھیں جن سے شادی چودہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ ان سے ایک فرزند شیخ محمد پیدا ہوئے جو اپنے علم و فضل کے سبب محدث کہلائے۔ اگرچہ انھوں نے طویل عمر پائی اور ۱۲۰۸ھ / ۹۴-۱۷۹۳ء میں فوت ہوئے مگر علمی شہرت نہیں پائی جیسی کہ ان کے برادرانِ خود حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی (۲۵ر رمضان ۱۱۵۹ھ / ۱۳ر اکتوبر ۱۷۴۶ء -- ۷ر شوال ۱۲۳۹ء / ۶ر جون ۱۸۲۴ء)، شاہ رفیع الدین عبد الوہاب (م ۶ر شوال ۱۲۳۳ھ / ۹ر اگست ۱۸۱۸ء)، شاہ عبد القادر دہلوی (م ۱۹ر رجب ۱۲۳۰ھ / ۲۸ر جون ۱۸۱۵ء) اور شاہ عبد الغنی بالخصوص اول الذکر تین نے حاصل کی۔

حضرت ولی اللہ دہلوی کے فرزندوں میں سب سے بڑے عالم، کثیر التصانیف اور جانشینِ پدر شاہ عبد العزیز تھے۔ وہ نہ صرف مدرسۂ رحیمیہ کے شیخ و مربی بنے بلکہ سب سے زیادہ تصانیف لکھنے والے بھی۔ ان کی تصانیف میں "بستان المحدثین"، "تحفہ اثنا عشریہ"، "تفسیر عزیزی"، "عجالہ نافعہ"، "فتاویٰ

عزیزیہ"،"ملفوظاتِ عزیزی" اور متعدد دوسری شامل ہیں اور جن کی تعداد بیس سے اوپر ہے۔وہ شیخ المشائخ، استاذ الاساتذہ اور نابغۂ عصر تھے۔ان کے برادرِ خورد شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کا لفظی اردو ترجمہ کیا اور متعدد دوسری تالیفات و رسائل چھوڑے۔ تیسرے برادر شاہ عبد القادر دہلوی نے اپنے والدِ ماجد کے فارسی ترجمۂ قرآن -"فتح الرحمٰن"- سے متاثر و برانگیختہ ہو کر بامحاورہ اردو میں ترجمہ قرآن کیا جو "موضحِ قرآن" کے نام سے مشہورِ عالم ہوا اور بعد کے تمام اردو تراجم قرآنی کا سرچشمہ و منبع بنا۔ شاہ عبد الغنی کا جوانی میں انتقال ہو گیا اور وہ اپنی علمی یادگار نہیں چھوڑ سکے لیکن ان کے فرزند شاہ اسمٰعیل شہید (م ۱۸۳۱ء) نے علم و عمل کی دنیا میں اپنے مستقل نشانات قائم کئے۔خاندانِ ولی اللٰہی کے دوسرے اخلاف اور فرزندوں نے علم و حکمتِ ولی اللٰہی کے چراغ ہر دور میں جلائے رکھے اور ہزارہا طلبہ کو علم و حکمت، طریقت و معرفت اور جد و جہاد سے آشنا کیا۔

تصانیف

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ "ہمارے پاس اس امر کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے کہ شاہ صاحب کی کون سی کتاب کس دور کی ہے تاہم قرائن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے سفر حرمین سے پہلے بظاہر تصنیف و تالیف کا کوئی کام نہیں کیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔" (فاروق قادری، تقدیم انفاس العارفین، ۷، بحوالہ مولانا گیلانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ محدث، ۲۶۵) جبکہ متعدد تجزیہ نگاروں نے قرائن اور شواہد کی بنیاد پر ان کی تصانیف کی توقیت کی ہے اور بعض نے ادوار بھی قائم کئے ہیں۔ان میں اطہر عباس رضوی (۲۸-۲۲۰)، جے ایم ایس بلجان (۱۴-۸)، خاص طور سے اور غلام مصطفی قاسمی، غلام حسین جلبانی وغیرہ شامل ہیں۔بہر کیف بعض تالیفات و رسائل کی قطعی تاریخیں مل جاتی ہیں اور بعض کے پکے قرائن۔ حروفِ تہجی کے مطابق یا موضوع وار فہرستِ تصانیف کے بالمقابل ادوارِ زمانی کے اعتبار سے ان کا جائزہ زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولفِ علام کے فکری ارتقاء، تالیفی ترتیب اور علمی تنظیم کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور اس حقیقتِ امری کی جانب بھی کہ تالیف و تصنیف ہو یا کوئی اور کام توفیقِ الٰہی پر منحصر ہوتا ہے اور جب اور جیسے یدِ الٰہی کی کارفرمائی ہوتی ہے مولفین و علماء کار ہوارِ قلم و ذہن ادھر موڑ دیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسی توفیقِ الٰہی کو متعدد ناموں -الہام، کشف، رویاء، فیض و فیضان، مشاہدہ وغیرہ- سے حسبِ روایتِ عصر یاد کیا ہے۔

(الف) زیارتِ حرمین سے قبل (۳۲-۱۷۰۳ء)

یہ کہنا مشکل ہے کہ اول اول شاہ صاحب نے مطالعہ و تدریس کے بعد کب قلم پکڑا لیکن یہ طے ہے کہ تدریس و تعلیم کے دورِ اول (۳۲-۱۷۲۰ء) میں جب دورانِ مطالعہ و تعلیم ان پر علومِ حظیرۃ القدس کا فیضان شروع ہوا اور بقولِ ان کے ان کے ذہن و دماغ اور قلب میں نئے نئے نکات آنے لگے تو لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور ایسا ان کے بارہ سالہ دورِ تعلیم کے غالبًا اواخر میں ہوا۔ اس دور کی صرف دو تین کتابوں کا ذکر کیا گیا:

(۱) "القصیدۃ الملامیۃ" (عربی)، جو فیوض الحرمین کے گیارہویں مشاہدہ کے ختم پر منقول ہے۔

(۲) "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" (عربی)، اشغال و اعمالِ تصوف و سلاسل پر جس کا "فیوض الحرمین" کے چھتیسویں مشاہدہ میں حوالہ آیا ہے۔ (طباعتیں: مطبعۃ الجمالیہ مصر ۱۲۹۰ھ؛ مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ؛ ۱۳۰۷ء۔ اردو تراجم: از خرم علی بلہوری، بمبئی غیر مورخہ بعنوان "شفاء العلیل" دہلی غیر مورخہ؛ محمد سرور، لاہور ۱۹۴۶ء؛ ۱۹۹۸ء بعنوان "تصوف کے آداب و اشغال اور ان کا فلسفہ"۔

(۳) آغازِ ترجمہ فارسی قرآنِ کریم بعنوان "فتح الرحمٰن"۔ یہ قرائن سے ثابت ہے کہ اس ترجمہ کا آغاز سفر حرمین نے قبل ہو چکا تھا۔ وہ متعدد مراحل میں کیا گیا اور بعد میں تکمیل پذیر ہوا۔ اس کا اولین محرک متنِ قرآن کے طلبہ کا تدریسی تقاضا تھا۔

(ب) قیامِ حرمینِ شریفین کا عہد (۳۲-۱۷۳۱ء)

(۴) "المقدمۃ السنیۃ فی الانتصار لفرق السنیۃ" (عربی)۔ مجددِ الفِ ثانی کے فارسی رسالہ "ردِ روافض" کا عربی ترجمہ جو شاہ صاحب نے اپنے مدنی استاذِ حدیث شیخ ابو طاہر کردی کی فرمائش پر کیا۔ مترجمِ علام نے توضیحی حواشی، تنقیدی تعلیقات دینے کے علاوہ مولفِ گرامی کی بعض مسامحات کا بھی ذکر کیا ہے۔ (طباعت: ابو الخیر اکیڈمی دہلی غیر مورخہ)

(ج) حرمین سے واپسی کے معاً بعد کا دور (۳۹-۱۷۳۲ء)

(۵) "الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین" (عربی)، رویاء میں فیضانِ احادیث (طباعت: سہارنپور ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء؛ اردو ترجمہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء)

(۶)"النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر"(عربی)، احادیث بروایتِ شیخ ابو طاہر (طباعت: سہارنپور ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء، مسلسلات کے ساتھ طبع ہوا)

(۷)"المسلسلات من حدیث النبی"(عربی)،اسانیدِ حدیث پر مجموعہ مروی از مشائخِ حرمین،(مذکورہ بالا)

(۸)"اربعون حدیثاً مسلسلات بالاشراف فی غالب سندھا"(عربی)۔ مجموعۂ اربعین بروایتِ ابو طاہر کردی،(مذکورہ بالا)

(۹)"الارشاد الیٰ مہمات علم الاسناد"(عربی) اسانیدِ حدیث کی اہمیت پر (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء؛ سجاد پبلشرز لاہور ۱۹۶۰ء)

(۱۰)"شرح تراجم ابواب صحیح البخاری"(عربی)، بقول قاسمی مؤلفہ در ۶-۱۱۴۵/۳-۱۷۳۲ء۔(طباعتیں: حیدر آباد دکن ۱۹۴۹ء؛ اصح المطابع دہلی غیر مورخہ اور مطبع نور الانوار آرہ، بہار غیر مورخہ)

(۱۱)"الطاف القدس فی معارف لطائف النفس"(فارسی)،لطائف کی بحث اور تصوف کا فلسفہ (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ مع اردو ترجمہ از عبد الحمید سواتی؛ گوجرانوالہ ۱۹۶۴ء؛ انگریزی ترجمہ جلبانی و ڈی پنڈل بری(D. Pendelberry)لندن ۱۹۸۴ء بعنوان "The Sacred Knowledge"

(۱۲)"فیوض الحرمین"(عربی)، فلسفۂ تصوف پر رسالہ جس میں روضۂ نبوی پر مراقبہ کے دوران ہونے والے مبشرات و اکتشافات و مشاہدات کا بیان ہے۔سفرِ حرمین کے مابعد کی تصنیف(طباعتیں: مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۸ھ؛ تراجم اردو: محمد سرور لاہور ۱۹۶۷ء؛ نومبر ۱۹۹۶ء بعنوان "مشاہدات و معارف")

(۱۳-۱۹)"انفاس العارفین"(فارسی / عربی): سات رسائل کا مجموعہ:(۱)"بوارق الولایۃ": شیخ عبد الرحیم کے حالات و کمالات (۲)"شوارق المعرفۃ": شیخ ابو الرضا محمد کے حالات و کمالات و ملفوظات (۳)"المداد فی مآثر الاجداد": آباء و اجدادِ شاہ کا تذکرہ (۴)"النبذات الابریزیۃ فی اللطائف العزیزیۃ": شیخ عبد العزیز اور ان کے خاندان کے سوانح و اوصاف(۵)"العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ": شیخ محمد پھلتی کا تذکرہ(۶)"انسان العین فی مشائخ الحرمین": شیوخ و اساتذۂ حرمین کا

تذکرہ(۷)الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف: خودنوشت سوانح عمری۔(طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۵ھ؛ کراچی ۱۳۵۸ھ؛ اردو تراجم :از محمد فاروق قادری لاہور ۱۹۷۴؛ ۱۹۹۸ء؛ مکتبہ الفلاح دیوبند غیر مورخہ؛از محمد اصغر فاروقی لاہور ۱۹۷۷ء؛ محمد ایوب قادری وغیرہ)

(۲۰) حجۃ اللہ البالغہ(عربی)۔ عظیم ترین تصنیف، علم اسرارِ دین کا شاہکار، بیمثال علمی کارنامہ (مولفہ در ۱۱۴۵-۵۱ھ /۱۷۳۲-۳۹ء) طباعتیں: مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ؛ بولاق مصر ۱۲۹۶ھ /۱۸۷۷ء؛ ادارۃ الطبعۃ المنیریۃ قاہرہ ۱۳۵۲ھ /۱۸۳۳ء؛ ملتزم الطبع والنشر، دارالکتب الحدیثہ قاہرہ ۵۳-۱۹۵۲ء؛ کتاب خانہ رشیدیہ دہلی ۱۹۵۳ء وغیرہ۔اردو تراجم :ابو محمد عبدالحق حقانی، اصح المطابع کراچی غیر مورخہ بعنوان"نعمۃ اللہ السابغۃ"؛ خالد احمد اسرائیلی، کتاب خانہ اسلامی لاہور غیر مورخہ بعنوان:"آیات اللہ الکاملۃ"؛ عبدالرحیم، احسن برادرز لاہور غیر مورخہ۔وغیرہ: انگریزی ترجمہ مارسیا کے ہرمینسن(Marcia.K.Hermansen)، The Conclusive Argument from God، ای، جے، برل، لائیڈن ۱۹۹۶ء(جلد اول)

(۲۱) ہمعات(فارسی)، مؤلفہ در جمادی الثانیہ ۱۱۴۸ھ /اکتوبر -نومبر ۱۷۳۵ء۔ تصوف کے ارتقاء و تاریخ و مقاصدِ سلاسل پر(طباعتیں:لاہور ۱۹۴۱ء؛ مرتبہ قاسمی، حیدر آباد سندھ ۱۹۶۴ء؛ اردو تراجم : محمد سرور، لاہور ۱۹۶۴؛ ۱۹۹۹ء بعنوان:"تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ"؛ مکتبہ رحمانیہ دیوبند ۱۹۶۹ء)

(۲۲) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ(فارسی)، اوراد و اشغالِ سلاسلِ تصوف؛ مؤلفہ درمیان اکتوبر-نومبر ۱۷۳۵ء اور ۴/اکتوبر ۱۷۴۷ء (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی ۱۳۱۱ھ؛ مکتبۂ سلفیہ ۱۹۶۹ء(دوابواب کی تلخیص بعنوان"اتحاف النبیہ")

(۲۳) تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء(عربی)، قرآنِ مجید میں مذکور قصص الانبیاء کے اسرار و حِکَم(طباعتیں:مرتبہ قاسمی، حیدر آباد سندھ ۱۹۶۶ء؛ تراجم اردو: مطبعِ احمدی دہلی ۱۸۹۹ء؛ الرحیم، جلد ۳، شمارہ ۱۲، مئی ۱۹۶۶ء؛ انگریزی : جلبانی، حیدر آباد سندھ ۱۹۷۲ء؛ بلجان، بعنوان: *A Mystical Interpretation of Prophetic Tales by an Indian Muslim: Shah Wali Allah of Dehli's ,Tawīl-al-Aḥādīth*، ای، جے، برل، لائیڈن ۱۹۷۳ء)

(۲۴) "فتح الرحمٰن فی ترجمہ القرآن" (فارسی)۔ عظیم ترجمہ اور شاندار تفسیر قرآنِ کریم، آغاز دورِ اول میں، تکمیل کی تاریخ ہے: عیدالاضحیٰ ۱۱۵۰ھ /۳۱/مارچ ۱۷۳۸ء: (طباعت اول: ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء؛ متعدد طباعتیں: مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۸۵ھ /۱۸۶۹ء، مطبع فاروقی دہلی ۱۲۹۴ھ؛ لکھنؤ ۱۹۰۲ء؛ نور محمد کارخانہ تجارت کراچی غیر مورخہ؛ تاج کمپنی لاہور ۱۹۸۶ء وغیرہ)

(د) تالیف کا آخری دور (۱۷۴۰-۱۷۶۲ء)

(۲۵) "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" (عربی)، نعتِ نبوی میں قصیدۂ بائیہ مع قصیدۂ ہمزیہ۔ دونوں کی فارسی شرحِ شاہِ موصوف مؤلفہ در ۲۴/ربیع الثانی ۱۱۵۶ھ / ۱۷/جون ۱۷۴۳ء۔
(طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ وغیرہ؛ مع اردو ترجمہ از پیر محمد کرم شاہ ازہری، لاہور ۱۹۸۵ء)

(۲۶) "القصیدۃ الھمزیۃ فی المدیح النبویہ" (عربی)، دوسرا رسالہ نعت مؤلفہ در اواخر ۱۱۴۷ھ / اوائل ۱۷۴۵ء مع فارسی شرح مولفہ در ۱۷۶۲ء؛ مع اردو ترجمہ مذکورہ بالا۔

(۲۷) "مقدمہ در فنِ ترجمۂ قرآن" (فارسی) "المقدمہ فی قوانین الترجمۃ" دوسرا عنوان، "فتح الرحمٰن" میں شامل ہے۔ دوسرا نسخہ زیادہ مفصل ہے جو مخطوطات کی شکل میں ہے۔ اردو تراجم بھی ہوئے ہیں۔)

(۲۸) "ہوامع" (فارسی)، امام شاذلی کی "حزب البحر" کی شرح مع متن (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ؛ مطبع روزانہ اخبار دہلی غیر مورخہ، وغیرہ)

(۲۹) "سطعات" (فارسی)، فلسفۂ تصوف (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ؛ کراچی ۱۹۳۹ء؛ مرتبہ قاسمی، حیدر آباد سندھ ۱۹۶۴ء؛ تراجم اردو: قاسمی حیدر آباد سندھ ۱۹۶۴ء؛ محمد متین ہاشمی، لاہور ۱۹۸۶ء؛ انگریزی: جلبانی حیدر آباد سندھ ۱۹۷۰ء؛ کتاب بھون دہلی ۱۹۸۱ء)

(۳۰) "المسوّیٰ من احادیث الموطاء" (عربی) "موطاء امام مالک" کی شرح مع ترتیبِ احادیث و فقہی استنباطات (طباعتیں: مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۹۳ھ؛ ۱۳۴۷ھ؛ مکہ مکرمہ غیر مورخہ؛ حیدر آباد سندھ وغیرہ؛ تراجم اردو: الرحیم جلد ۱، شمارہ ۵، اکتوبر ۱۹۶۳ء شمارہ ۶، نومبر ۱۹۶۳ء)

(۳۱) "الخیر الکثیر" (عربی)، فلسفۂ تصوف، مرتبہ شاہ محمد عاشق پھلتی در ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء (طباعتیں: مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۲ھ؛ مجلسِ علمی ڈابھیل ۱۳۵۴ھ؛ القاہرہ ۱۹۷۴ء؛ انگریزی: جلبانی، حیدر آباد سندھ ۱۹۷۴ء)

(۳۲)"الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" (فارسی)، اصولِ تفسیر پر عظیم رسالہ (طباعتیں: مطبع احمدی ہگلی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء؛ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۸ء؛ مکتبۂ سلفیہ لاہور ۱۹۵۱ء؛ قدیمی کتب خانہ کراچی غیر مورخہ؛ تراجم اردو: رشید احمد انصاری، دہلی ۱۹۶۳ء؛ محمد سالم عبد اللہ کراچی غیر مورخہ؛ لاہور غیر مورخہ؛ عربی: محمد اعزاز علی دیوبند؛ سلمان حسینی ندوی، لکھنو، ابو سفیان مفتاحی، مئو ؛ وغیرہ؛ انگریزی: جلبانی بعنوان The Principles of Quran Commentary، اسلام آباد ۱۹۸۵ء)

(۳۳)"فتح الخبیر بما لا بد من حفظ علم التفسیر" (عربی)، احادیثِ حضرت ابنِ عباس کی روشنی میں مشکل مقاماتِ قرآن کی تفسیر (طباعتیں بالعموم بطور بابِ آخر "الفوز الکبیر"؛ مطبع احمدی ہگلی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء؛ نو لکشور لکھنو ۱۳۱۴ء، وغیرہ)

(۳۴)"قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" (فارسی)، فضائلِ حضرات ابو بکر صدیق و عمر فاروق (طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۰ھ؛ مطبع روزانہ اخبار دہلی ۱۸۹۹ء؛ مکتبہ سلفیہ ۱۹۷۶ء؛ تراجم اردو: احمد علی، علوی پریس لکھنو ۱۲۹۶ھ؛ مفید عام پریس آگرہ ۱۲۹۵ھ)

(۳۵)"صرفِ میر" (منظوم / فارسی)، فرزند شاہ عبد العزیز مولود در ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء کی تعلیم صرف کے لئے میر جرجانی (م ۱۴۱۳ء) کا فارسی منظوم ترجمہ، مؤلفہ در ۱۱۶۵ھ / ۵۲-۱۷۵۱ء؛ (طباعتیں: مطبع محمدی لاہور ۱۲۹۳ھ)

(۳۶)"المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ" (فارسی)، وصیت نامہ کے عنوان سے معروف، نصائح برائے شاگردان و متعلقین (طباعتیں: مطبع مطبع الرحمٰن دہلی ۱۲۶۸ھ؛ مطبع مسیحی کانپور ۱۲۷۳ھ)

(۳۷)"الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" (عربی)، فقہاء کے مسلکی اختلاف پر رسالہ (طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء؛ مطبع صدیقی بریلی ۱۳۰۷ھ؛ مرتبہ رشید احمد جالندھری لاہور ۱۹۷۱ء؛ مرتبہ محی الدین خطیب قاہرہ ۱۹۶۰ء؛ مرتبہ عبد الفتاح ابو غدہ، بیروت ۸-۱۹۷۷ء؛ تراجم اردو: محمد عبد اللہ بلیاوی بعنوان "کشاف" لکھنو ۱۸۸۶ء؛ محمد عبد الشکور فاروقی بعنوان "وصاف" لکھنو ۱۹۱۰ء ؛ صدر الدین اصلاحی "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ" رامپور ۱۹۵۲ء؛ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۷۳ء)

(۳۸)"عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید" (عربی)، اجتہاد و تقلید کے امور پر رسالہ مؤلفہ قبل ۴ر ستمبر ۱۷۵۹ء (طباعتیں: مطبع صدیقی بریلی ۱۳۰۹ھ؛ مکتبۂ سلفیہ لاہور ۱۹۶۵ء؛ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء مع اردو ترجمہ؛ تراجم: بعنوان "سلک مروارید" ۱۳۱۰ھ؛ محمد عبد الشکور

فاروقی لکھنو غیر مؤرخہ ؛ساجد الرحمٰن صدیقی، کراچی ۱۳۷۹ھ، انگریزی: محمد داؤد رہبر (تلخیص) "مسلم ورلڈ"، لندن، جلد ۵۵ شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۵۵ء)

(۳۹) لمحات (عربی)، فلسفۂ تصوف (طباعتیں: مرتبہ قاسمی حیدر آباد سندھ غیر مؤرخہ ؛تراجم انگریزی: جلبانی و ڈی ،بی، فرائی حیدر آباد سندھ ۱۹۷۰؛ لندن ۱۹۸۰ء بعنوان *Sufism and the Islamic Tradition, Lamḥāt and Saṭ'aāt of Shah Wali Allah of Dehli*

(۴۰) "البدور البازغۃ" (عربی)، فلسفۂ دین و تصوف کا قاموسی شاہکار، "حجۃ اللہ البالغہ" کا توأم (طباعتیں: مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۴؛ حیدر آباد سندھ ۱۹۷۰ء؛ تراجم اردو: قاضی مجیب الرحمٰن، لاہور ۲۰۰۰ء، انگریزی: جلبانی، اسلام آباد ۱۹۸۵ء)

(۴۱) "التفہیمات الالٰھیۃ" (عربی / فارسی)، فلسفۂ دین و تصوف پر "تفہیم" کے عنوان سے چھوٹے چھوٹے خطبات (طباعتیں: مجلسِ علمی ڈابھیل ۱۳۵۵ھ ؛مدینہ پریس بجنور ۱۹۳۶ء؛ حیدر آباد سندھ ۱۹۷۳ء)

(۴۲) "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" (فارسی)، اسلامی خلافت پر اصولی اور تاریخی مباحث، نامکمل تصنیفِ شاہ (طباعتیں: مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ /۱۸۶۹ء، سہیل اکیڈمی لاہور ۱۹۷۶ء، قدیمی کتب خانہ غیر مورخہ جدید ترین طباعت مع تراجم اردو: محمد عبد الشکور فاروقی، انشاء اللہ، حامد الرحمٰن فاروقی، اشتیاق احمد دیوبندی، کراچی غیر مورخہ)

(۴۳) "المصفّٰی" (فارسی)، "المسوّیٰ" کی توأم فارسی شرحِ "موطا"، مرتبہ و شائع کردہ شاہ محمد عاشق پھلتی بعد وفاتِ مولفِ علام (طباعتیں: مطبع فاروقی دہلی ۱۲۹۳ھ /۱۸۷۶ء، مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۹۳ھ؛ محمد علی کارخانہ اسلامی کتب کراچی ۱۹۸۰ء تراجم اردو: الرحیم جلد ۱، شمارہ ۵، اکتوبر ۱۹۶۳ء (نامکمل)؛ سید عبد اللہ مطبع احمدی کلکتہ ۱۲۹۴ھ)

اطہر عباس رضوی نے کل ۴۱ تصانیف کا ذکر کیا ہے تاہم ان کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ۱۷۳۱ء سے قبل کا دور، دو کتابیں (۲) ۱۷۳۲-۳۹ء کا دوسرا دور، ۱۱ کتابیں

(۳) ۱۷۳۹-۴۷ء کا تیسرا دور، دس کتابیں (۴) ۱۷۴۷-۶۲ء کا چوتھا دور، نو کتابیں۔

جبکہ وہ نو مزید کتابوں کا زمانۂ تصنیف متعین نہیں کر سکے۔ بلجان نے کل ۳۴ کتابوں کا ذکر کیا مگر وہ

آخری دور کو صحیح طور سے تقسیم نہیں کر سکے اور کئی کتب کے زمانۂ تعین سے بھی قاصر رہے۔ جلبانی اور قاسمی کی تقسیمِ ادوار جزئی ہے۔ تذکرہ نگار بالعموم ولی اللٰہی تصانیف کی تعداد مختلف بتاتے ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے ان کی تعداد اٹھہتر تک پہونچادی ہے۔ اس میں مکررات بھی شامل ہیں اور "انفاس العارفین" جیسی کتب کے مختلف اجزا بھی۔ محمد رحیم بخش دہلوی نے موضوع وار تقسیم کی ہے اور کل پینتالیس کتابوں کا تعارف دیا ہے (۸۱-۵۴۲) جب کہ برکاتی نے چوالیس تصانیف کی اولین طباعتوں کا ذکر کیا ہے اور مزید سترہ غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست دی ہے (۲۵-۲۳)

بنیادی فکر کی حامل تصانیف کا ذکر اوپر آچکا تاہم بعض اہم کتابوں اور غیر اہم رسائل کا بیان رہ گیا تھا جو مختصراً درج ذیل ہے:

۱۔ "سرور المحزون فی سیر الامین المامون" (فارسی)، ترجمہ "نور العیون" تالیف ابن سید الناس (م ۱۳۳۴ء)۔ مختصر سیرتِ نبوی، مرزا مظہر جانِ جاناں کی فرمائش پر ان کی عربی مختصر کو فارسی زبان میں منتقل کیا ہے۔ (طباعتیں: مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ؛ کراچی ۱۳۵۸ھ؛ تراجم اردو: مولا بخش چشتی، ستارہ ہند دہلی ۱۳۱۵ھ بعنوان "الکنز المکنون"؛ عاشق الٰہی، مطبع محمدی دہلی غیر مورخہ بعنوان "الذکر المیمون"؛ ابو القاسم بن عبد العزیز ہسوی، ٹونک ۱۲۷۱ھ بعنوان "عین العیون" وغیرہ)

۲۔ "البلاغ المبین" (فارسی)، رسالۂ تصوف (طباعت: مطبع مجتبائی غیر مورخہ)

۳۔ "حسن العقیدہ" (عربی)، عقائدِ اسلامی کا رسالہ، شامل خمسہ رسائل (طباعت: مطبع احمدی دہلی غیر مورخہ؛ تراجم اردو: مطبع روزانہ اخبار دہلی غیر مورخہ؛ شرح از محمد اویس نگرامی بعنوان "العقیدۃ الحسنۃ")

۴۔ "دیوان عربی" (عربی)، مرتبہ شاہ عبد العزیز دہلوی، مخطوطات کی شکل میں

۵۔ "رسالۂ دانشمندی" (فارسی)، اصولِ تعلیم پر، (طباعتیں: مطبع احمدی دہلی ۱۸۹۹ء؛ تراجم اردو: محمد سرور لاہور ۱۹۶۴ء؛ عربی: محمد اکرم ندوی، ۱۴۰۳ھ)

۶۔ "زہراوین" (فارسی)، ترجمہ سورۂ بقرہ و آلِ عمران بشکل مخطوطہ، "فتح الرحمٰن" کا جزو بھی ہونا ممکن)

۷۔ مکاتیب کے کئی مجموعے مرتب کئے گئے ہیں:

(۱) مجموعۂ مکاتیب" مرتبہ شاہ عبد الرحمٰن بن شاہ محمد عاشق پھلتی (فارسی) (مخطوطات کی

صورت میں۔ تراجم اردو: "نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی" از نسیم احمد فریدی، پھلت ۱۹۹۸ء، مع مقدمہ نثار احمد فاروقی)

(۲) "کلماتِ طیبات" مطبوعہ؛ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ
(۳) مکتوبات المعارف؛ مطبع العلوم سہارنپور ۱۳۰۴ھ؛ مطبع مجتبائی دہلی
(۴) مکتوب مدنی؛ تفہیماتِ الٰہیہ میں شامل؛ ترجمہ اردو: محمد حنیف ندوی لاہور ۱۹۶۵ء
(۵) "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات"؛ مرتبہ خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۹۵۰ء

شاہ صاحب کی بعض تصانیف کا ذکر مقالاتِ طریقت، اجازہ ناموں اور دیگر کتب و رسائل میں بطور حوالہ آیا ہے۔ بعض کے مخطوطات بھی موجود ہیں مگر متعدد کے محض حوالے اور نام۔ نثار احمد فاروقی نے پانچ کتابوں کی مزید فہرست دے کر ان کو تحقیق طلب بتایا ہے اور آخر میں آٹھ کتابوں کو جعلی اور شاہ صاحب کی طرف غلط طور سے منسوب قرار دیا ہے۔ ان تمام تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ ابھی تک باقی ہے کہ اس کے بغیر فکرِ ولی اللٰہی کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی متاخر علمائے کرام، دانشورانِ ملت اور اکابرِ امت نے ان کے علوم و معارف کی تنقیح و تحلیل کرنے کی اپنی سی کوششیں کی ہیں۔

وفات و تدفین

بقول شاہ عبد العزیز "والدِ ماجد حضرت شاہ ولی اللہ بہت کم بیمار ہوتے تھے"۔ مگر آغازِ ذوالحجہ ۱۱۷۵ھ / اواخرِ جون ۱۷۶۲ء کو بیمار پڑے تو سخت بیمار ہوئے۔ بیماری کا آغاز موضع بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں ہوا۔ مرض نے طول کھینچا تو ۹؍ ذوالحجہ ۱۱۷۵ھ / یکم جولائی ۱۷۶۲ء کو دہلی لایا گیا۔ جہاں اپنے ایک عزیز مرید و شاگردِ رشید بابا فضل اللہ کشمیری کے مکان پر مسجد روشن الدولہ کے احاطے میں قیام کیا۔ جوں جوں علاج ہوتا گیا مرض بڑھتا گیا۔ بالآخر ۲۹؍ محرم ۱۱۷۶ھ / ۲۰؍ اگست ۱۷۶۲ء کو بوقتِ ظہر وفات ہو گئی۔ اسی دن قبرستانِ مہندیان میں والدِ ماجد شیخ عبد الرحیم کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ حادثۂ وفات کے سنہ کی کئی تاریخیں نکالی گئیں جن میں "او بود امامِ اعظم دیں" اور "ہائے دلِ روزگار رفت" زیادہ معروف ہیں۔

فکر و حکمت

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر و حکمت کی دو ممتاز سطحیں ملتی ہیں: ایک شارحانہ دوسری فلسفیانہ۔ اور یہ دونوں فکری لہریں کبھی ساتھ ساتھ چلتی ہیں: شارحانہ فکر کے نیچے فلسفیانہ فکر کے دھارے رواں دواں رہتے ہیں۔ اور کبھی دونوں فکریں بالکل الگ الگ ممتاز طریقے سے بہتی ہیں لیکن اس عالم میں بھی وہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں، تائید کرتی ہیں۔ دراصل ان فکری سطحوں کی روانی کے طریقوں کی تعیین موضوعات و مضامین کی نوعیتوں سے از خود ہوتی جاتی ہے۔ جہاں فکرِ شاہ ظواہر دین و تصوف اور مسلماتِ علوم و فنون سے تعرض کرتی ہے اس کی نوعیت شارحانہ، مفسرانہ اور بیانیہ ہو جاتی ہے۔ باطنی پہلوؤں اور ان کے اسرار و رموز اور حکمتوں کے بیان میں طرزِ اظہار فلسفیانہ، حکیمانہ اور مفکرانہ بن جاتی ہے۔

فکرِ ولی اللّٰہی کی شارحانہ نوعیت زیادہ تر اسلامی علوم و فنون کے بیان میں ملتی ہے۔ قرآنیات میں ترجمہ و تفسیر، اصولِ تفسیر و قوانینِ ترجمہ، حدیثیات میں تاریخِ تدوین، انواعِ کتب، اغلاطِ رواۃ، نقد و تجزیہ فن، فقہیات میں ارتقاءِ فقہ، مسالک و مذاہب، ائمہ اربعہ، کتب و اصولِ فن، سیرت و تاریخ میں سوانح و واقعاتِ سید المرسلین ﷺ، آغازِ خلافتِ الٰہی و اسلامی، ارتقائے ادارہ و ادوارِ خلافت، طبقاتِ خلفاءِ اسلام اور ان کے علمی و تہذیبی عطایا، تذکرہ و ترجمہ میں حالات و کرامات، ملفوظات و افکار، اور تصوف و طریقت میں آغاز و ارتقاء، ادوارِ سلاسل و افکار، اشغال و اعمال، اوراد و وظائف وغیرہ پر انداز بیانیہ، شارحانہ اور حکیمانہ ہوتا ہے۔

لیکن جب انھیں علوم و معارف کے باطنی پہلوؤں کو اجاگر و تابناک بناتے ہیں تو فکر و حکمت کی سطح تفکر و تعقل کی بلندی اور فکرِ مرتفع پر جا پہونچتی ہے۔ عقائد میں ذات و صفاتِ الٰہی، عالمِ بالا، ملاءِ اعلیٰ، ملائکہ، حظیرۃ القدس، عالمِ مثال و ارواح، تجلیات و تجلیٔ اعظم، وحی، الہام، القاء، نبوت و رسالت، کلامِ الٰہی، آخرت و معاد، حشر اجساد، روح، نسمہ، نفسِ ناطقہ وغیرہ کا بیان فلسفیانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے علومِ اسلامی کا معاملہ ہے۔ ایمانیات، عبادات و معاملات و اخلاق کے مباحث میں اسرار و رموز کا پتہ لگانے میں حکمت آمیز ہو جاتے ہیں۔ سیرتِ نبوی کے بعض واقعات جیسے نبوت کا استحقاق، مبشرات و معجزات، شقِ صدر و اسراء و معراج وغیرہ کے بیان میں حضرتِ شاہ صاحب بیان سے زیادہ حامل و شارحِ حکمت ہو جاتے ہیں۔ سماجیات میں فطرتِ انسان، اس کی لیاقتوں،

صلاحیتوں، قوموں اور کائنات اور اس کے نظام نیز تعلق مع اللہ کے مباحث خالصتاً فلسفہ و حکمت کے نقطہ نظر سے معرضِ تحریر میں آتے ہیں۔ تصوف، طریقت و معرفت میں جب شاہ ولی اللہ دہلوی علومِ باطنی کے فیضان، اس کے منابع و مصادر، قلب وجدان پر ان کے اثرات، ملاءِ اعلیٰ سے فطرتِ انسانی کے تعلقات، ذاتِ الٰہی سے نظامِ کائنات کے رشتہ، مکاشفات و مشاہدات، رویاءِ صالحات وغیرہ سے بحث کرتے ہیں تو فلاسفۂ تصوف کا رنگ و آہنگ قبول کر لیتے ہیں۔

تجزیۂ افکار و حِکَم میں صاحبِ نگارش و اظہار کا اپنا شعور و ادراک (Perception) بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ غلو و مبالغہ یا کسر و انکسار سے قطعِ نظر، وہ اس کے اپنے افکار و عطایا کا اندرونی تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب کا اپنا بیان ہے: ''...... خاکسار پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے مجھے ''خلعتِ فاتحیہ'' سے نوازا اور اس آخری دور کا آغاز میرے ہی ہاتھوں کرایا۔ اور مجھے اس طرح رہنمائی کی گئی کہ فقہ کے پسندیدہ مسالک کو یکجا کر کے فقہِ حدیث کی نئے سرے سے بنیاد رکھوں۔ اسی طرح اسرارِ حدیث، مصالحِ احکام، ترغیبات اور جو کچھ حضور رسولِ مقبول ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے، ان تمام کے اسرار و رموز کا بیان ایک مستقل فن ہے جس کے بارے میں اس فقیر سے زیادہ وقیع بات کسی اور سے نہیں بن آئی ہے۔ اگر کسی کو اس فن کی عظمت و بلندی کے باوجود میرے بیان میں شبہ گذرے تو اسے شیخ عزالدین ابن عبدالسلام کی کتاب ''قواعدِ کبریٰ'' دیکھنی چاہئے جس میں انھوں نے کس قدر زور مارا ہے مگر پھر بھی وہ اس فن کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ پائے۔ اور طریقۂ سلوک، جو کہ خدائے بزرگ و برتر کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے اور جسے اس دور میں رائج ہونا ہے، وہ مجھے الہام کیا گیا...... مجھے کمالاتِ اربعہ - یعنی ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی۔ جو اس دنیا کے طول و عرض میں موجود ہیں اور نفوسِ انسانیہ کی استعداد اور ان کے کمال اور انجام کو جاننے کا علم عطا کیا گیا ہے۔ یہ دونوں علوم اس قدر اہم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کوئی ان کی گرد تک نہیں پہنچا۔ اور حکمتِ عملی جس کے ذریعہ اس دور کی اصلاح کی جا سکتی ہے، مجھے پوری طرح ودیعت کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ مجھے کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کے ذریعہ اس حکمتِ عملی کو مستحکم کرنے کی توفیق بھی بخشی کی گئی ہے۔ اور جو کچھ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے یا دین میں جو کچھ اضافے کئے گئے ہیں یا تحریف کی گئی ہے اور جو کچھ سنت ہے یا ہر فرقے نے جو نئی چیزیں دین میں رائج کی ہیں، ان تمام کی

مجھے پر کھ عطا کی گئی ہے۔۔۔۔۔" (انفاس العارفین ۷۔۲۰۶)

شاہ صاحب کی خود احتسابی اور نفسی تجزیہ میں جو اختصار و اشارت پائی جاتی ہے وہ ان کے افکار و عطایا کا محض ایک پر تو پیش کرتی ہے۔ ان کے خیالات و نظریات کا اظہار مختلف علوم و فنون کے حوالے سے ہوا ہے۔ لہذا مختلف اہلِ قلم و صاحبانِ تحلیل کی مانند الگ الگ موضوعات کے ذریعہ اس کا ایک محض جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ آغاز کتابِ الٰہی اور اس کے فنون سے کیا جارہا ہے کہ وہ دینِ اسلام و حکمتِ اسلامی کی اولین بنیاد و اساس بلکہ نہاد و فطرت ہے اور فکرِ ولی اللٰہی کی اصل روح بھی۔

قرآنیات

قرآنیات میں فکرِ ولی اللٰہی کا اظہار ان کی تین چار کتابوں ---"فتح الرحمٰن" "مقدمہ، الفوز الکبیر" "فتح الخبیر" اور "مقدمہ در قوانین ترجمہ"--- میں ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا بنیادی موقف یہ ہے کہ قرآن مجید چھوٹے چھوٹے خطبات کا مجموعہ ہے جن کو ایک سورت کے قالب میں نظم و ترتیب و حسنِ علاقہ کی بنا پر گوندھ دیا گیا ہے۔ جب متعدد مجموعۂ آیات یا خطبات آجاتے تو وہ سورت کی شکل اختیار کر لیتے اور آیتوں کی سورتوں میں ترتیب اور سورتوں کی یکے بعد دیگرے ترتیب و تنظیم ارشادِ الٰہی کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے فرمائی تھی اس لئے وہ توقیفی تھی۔ قرآنِ مجید کے یہ خطبات در اصل عربِ اول یا معاصرینِ نبوی کے طریقۂ تقریر و اظہار کے مطابق تھے۔ ان میں منطقی ترتیب اور سلسلہ بہ سلسلہ دلائل کی تنظیم کا التزام نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ بعد کے لکھنے والوں کا ہو گیا ہے۔ اس طریقۂ اظہار میں حکمت یہ تھی کہ وہ نافع ہو اور دل میں اتر جائے۔ اسی نفع رسانی کی حکمت کی بنا پر قرآنِ مجید میں مختلف اسالیب اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف التفات ملتا ہے اور ایک ہی علم کا بیان مرکز نہیں کیا جاتا بلکہ پانچوں علومِ قرآنی بار بار تصریف کے طریقہ سے لائے جاتے ہیں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ پانچوں یا دو تین ترتیب سے یا یکے بعد دیگرے آئیں بلکہ ایک خطبہ کو دوسرے خطبہ سے اور دوسرے کو تیسرے سے ایک مخصوص آہنگ کے ذریعہ پرویا جاتا اور وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مضمون کی مناسبت کی بنا پر دو خطبوں کو آپس میں جوڑ دیا جاتا ہے حالانکہ ان میں اسلوب کا بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ اسالیب کے آہنگ کی رعایت زیادہ کی گئی ہے۔

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا کلامِ منطوق ہے جو وحی کی صورت میں مختلف طریقوں سے رسولِ اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک پر القا کیا جاتا تھا۔ الفاظ اور ان کے معانی دونوں اللہ تعالیٰ کے کلام کے اجزاء ہیں اور دونوں وحیٔ الٰہی ہیں۔ معانی کے بغیر الفاظ کا قائم رہنا ناممکن ہے اور الفاظ اپنے معانی سے جدا نہیں ہو سکتے۔ قرآنِ مجید کی آیتوں، سورتوں، جملوں اور عبارتوں کے وہی معانی و مفاہیم اصلی اور الٰہی مراد ہیں جو ایک صاحبِ زبان کلام سنتے ہی سمجھتا ہے۔ ان کو علامہ ابنِ تیمیہ نے متبادر معانی کا نام دیا ہے۔ الفاظ و معانیٔ قرآن کی تفہیم ایک عامی اور ایک عالم اپنی اپنی ذہنی سطح اور عیارِ فہم کے مطابق کرتا ہے جن کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد رسولِ اکرم ﷺ جوں ہی اس کی تلاوت صحابۂ کرام کے سامنے کرتے تھے، جن میں مرد و عورت، شہری و بدوی، عالم و عامی سب ہی شامل ہوتے تھے، وہ فوراً ان کے معانی کا ادراک کر لیتے تھے حتیٰ کہ ایمان و عقیدہ سے محروم کفارِ مکہ و عرب بھی مومنینِ صادقین کی مانند ان کے صحیح معانی پالیتے تھے اور ان کے مفاہیم، جہات اور اثرات کا ادراک کر لیتے تھے، اگرچہ اپنی ہٹ کی وجہ سے انھیں تسلیم نہ کرتے تھے۔

بنیادی طور پر قرآن مجید پانچ علوم یا مضامین پر مشتمل ہے جو بالترتیب یہ ہیں: (۱) "علمِ احکام" (حرام و حلال، فرض وواجب، مستحب و مکروہ وغیرہ، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے)، (۲) "علمِ مناظرہ" (یہ علمِ کلام ہے جو غیر مسلم طبقات - یہود و نصاریٰ، مشرکین و منافقین - کے عقائد و نظریات سے متکلمانہ بحث کرتا ہے)، (۳) "علمِ تذکیر بآلاءِ اللہ" (انفس و آفاق اور تمام مخلوقاتِ کائنات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی یاد قائم کرنے کا علم ہے)، (۴) "علمِ تذکیر بایام اللہ" (قرآنی قصوں اور تاریخی واقعات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی اور توحید یاد دلانے کا علم ہے)، (۵) "علمِ تذکیر بالموت ومابعدہ" (موت اور دوسری دنیا کے احوال و معاملات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی تسلیم کرنے کا علم ہے)۔

اسباب یا شانِ نزول میں شاہ ولی اللہ کی بنیادی فکر یہ ہے اور بعض دوسرے محققین کی بھی کہ کسی آیت یا مجموعۂ آیات کے نزول کا بنیادی سبب کوئی زمانی یا مکانی واقعہ یا سبب ہو سکتا ہے مگر نزول کے بعد اس کا حکم و اطلاق آفاقی اور ابدی ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مخصوص سبب و واقعہ یا پس منظر سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اسی میں منحصر یا محدود نہیں رہتا۔

اسی بنا پر شاہ موصوف اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ قرآنِ مجید میں نسخ نہیں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قدماء کے وسیع دائرۂ نسخ کو اپنے طریقۂ تطبیق کے تحت سمیٹ کر صرف پانچ آیاتِ کریمہ تک محدود کر دیا تھا کہ صرف پانچ آیاتِ قرآنی منسوخ ہیں یا ان کے نسخ کو تطبیق کے ذریعہ دور کرنے میں وہ قاصر رہے۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی شاہ صاحب نے صرف مصلحتِ وقت کی خاطر ایسا کیا، ورنہ ان پانچ آیات کا نسخ بھی دور کر سکتے تھے لیکن معتزلی ہونے کے الزام سے بچنے کے لئے انھوں نے پانچ آیات میں نسخ مان لیا۔ صحیح بات یہی ہے کہ قرآنِ مجید میں نسخ نہیں پایا جاتا اور نہ نسخ کا وہ مفہوم ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ وہ نسخ کو ایک اجتہادی واستنباطی معاملہ مانتے ہیں جس میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

تفسیر قرآن مجید کے باب میں فکرِ ولی اللّٰہی کی دو سطحیں ملتی ہیں: طلبہ کی تعلیم و تدریس میں وہ تفسیری کتابوں سے استفادہ اولین مرحلہ میں صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ طالب علم میں جب عربی زبان و قواعد کی ضروری صلاحیت پیدا ہو جائے تو براہ راست قرآنِ مجید کا متن پڑھایا جائے اور الفاظ و عبارت کی تفہیم کے لئے لغاتِ عرب سے مدد لی جائے۔ بعد کے مرحلوں میں "جلالین" پڑھادی جائے جس کی تشریحات الفاظِ قرآنی سے کم ہیں اور صرف معانی و مفاہیم کی ترسیل و ابلاغ کرتی ہیں۔ بعد کی سطح میں وہ تفاسیر کی تدریس و تعلیم اور ان سے استفادہ کے بھی قائل تھے کہ اصل متنِ قرآن کی تفہیم کے بعد جب کوئی شخص مفسرین کی تشریحات و تفاسیر پڑھے گا تو وہ ان کے افکار و خیالات اور اغلاط کی بنا پر اصل متن کی تفہیم میں غلطی نہیں کرے گا۔ قرآنِ مجید کی ہر آیت و کلمہ کی تفسیر و تشریح کے بھی قائل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ترجمہ قرآن۔ "فتح الرحمٰن"۔ میں صرف ضروری جگہوں پر حواشی و فوائد لکھے ہیں، ورنہ آیاتِ کریمہ کے لفظی و بامحاورہ ترجمہ ہی کو ابلاغِ مطالب کے لئے کافی سمجھا ہے۔

ایک قرآنی بحث محکمات اور متشابہات سے متعلق ہے جس کے باب میں بعض مفسرین کا خیال ہے کہ موخر الذکر کے معانی و مفاہیم انسان کی فہم و گرفت سے بالا ہیں۔ شاہ صاحب متکلمین کی مانند ان کی تشریح میں غلو نہیں کرتے تھے بلکہ امام مالک، ثوری، ابن مبارک اور دوسرے تمام قدماء کی مانند یہ خیال رکھتے تھے کہ متشابہات کے معانی و مفاہیم بھی کوشش کر کے جانے جا سکتے ہیں۔ اسی کو قرآنِ مجید نے رسوخ فی العلم کہا ہے اور واضح کیا ہے کہ راسخین فی العلم

ان کے معانی کا ادراک کر سکتے ہیں۔ حروفِ مقطعات کو اسی زمرہ میں رکھا جاتا ہے۔ شاہ صاحب بعض مفسرین کی مانند اس بات کے قائل تھے کہ بعض حروفِ مقطعات سورتوں کے نام ہیں اور بعض ان اوصافِ کلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان کی سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ مزید بر آں حروفِ مقطعات کے علم سے کلامِ اسطرادی کی فہم پر اثر نہیں پڑتا۔

تحریفِ آیات کے باب میں شاہ صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ لفظی تحریف کی جگہ تاویل و تفسیر کی تحریف یا معنوی تحریف تھی جو یہود و نصاریٰ اپنی اپنی کتابوں میں کرتے تھے۔ پھر ان کی الہامی کتابیں- تورات و انجیل وغیرہ- حدیثِ قدسی کی مانند ہیں کہ الفاظ تو ان کے مرتبین کے ہیں اور معانی الہامِ الٰہی کے ہیں۔ شاہ صاحب سابقہ صحفِ ساویہ کے متون کے محفوظ ہونے کے قائل تھے، البتہ ان کو بخاری و مسلم کی صحاح کی طرح تسلیم کرتے تھے جن میں کلامِ الٰہی کے ساتھ کلامِ انبیاء بھی موجود ہے۔ تحریف اسی بنا پر زیادہ خطرناک ہے کہ الفاظ کو بدلنے کی بجائے کلام کو اس کے ظاہری معانی سے موڑ کر اپنے پسندیدہ مطلب کی طرف لے جایا جاتا ہے۔

بلاغتِ زبان و فصاحتِ کلام کے لحاظ سے بھی قرآنِ مجید عظیم ترین و بے مثال ترین کلام ہے۔ اسی بنا پر عربِ اولین اس سے فوری طور پر متاثر ہوتے تھے۔ چونکہ قرآنِ مجید اپنے احوالِ نزول کے علاوہ تمام زمان و مکان کے حالات کے تقاضے پورا کرتا ہے اسی بنا پر "اعظم و اجل و انجل علوم" ہے اور تاقیامت اپنی اس خصوصیت کی بنا پر باقی رہے گا کیونکہ محفوظیتِ قرآن کی ضمانت کلامِ قرآن کی مطابقتِ حال سے فراہم ہوتی ہے۔

حدیثیات

تدوینِ حدیث کے باب میں فکرِ ولی اللّٰہی بہت واضح ہے کہ عصرِ اول میں کتابتِ حدیث نہیں ہوتی تھی۔ پہلی صدی ہجری کے بعد اس کی کتابت کا اہتمام شروع ہوا اور دوسری صدی ہجری کے بعد اس کی تکمیل کا مقام آیا۔

شاہ صاحب کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صحت کے لحاظ سے کتبِ حدیث کی درجہ بندی کی ہے اور اس سے زیادہ یہ تحقیق حیران کن ہے کہ اصل کتابِ حدیث و فقہ امام مالک بن انس مدنی (۱۷۹ھ / ۸۱۵ء-۹۷ھ / ۹۵۷ء) کی موطا ہے اور باقی تمام کتبِ صحاح اس کی شروح۔ صحاحِ ستہ کے مؤلفین اور حاکم مستدرک نے امام مالک کی مراسیل کو موصول اور موقوف کو مرفوع

بنانے کی بے انتہا سعی کی ہے گویا یہ تمام کتابیں "موطا" کی شروح اور تکملے (متممات) ہیں۔ "صحیح مسلم"، "سنن ابی داؤد"، "سنن نسائی" اور "صحیح بخاری" اور "جامع ترمذی" کے ابواب فقہ جیسی تمام کتابیں "موطا" کے مستخرجات (نکالی ہوئی) کتب ہیں (المسوی، ۱/۱۰-۹؛ المصفیٰ ۱/۱۱/۷)

شاہ صاحب نے افضلیت اور برتر منزلتِ "موطا" کے لئے کئی ٹھوس دلائل دیئے ہیں: ایک یہ کہ "موطا" کی احادیث کی اسناد میں راویوں کی تعداد سب سے کم ہے۔ وہ تین چار سے زیادہ نہیں بڑھتی، دوسرے بیشتر راوی مدنی ہیں جو سب کے سب معروف و مشہور ہیں اور اس بنا پر معتمد و معتبر ہیں۔ ان رُواۃ میں زیادہ تر ایسے ہیں جو حضرت عمر کے قضایا اور فتاویٰ کے سب سے بڑے عالم تھے اور جن پر فقہ اور مذاہبِ فقہ کا دارومدار ہے۔ "موطا" نہ صرف ان فقہاءِ کرام بلکہ دوسرے محدث و فقیہ صحابۂ کرام و تابعین کے فتاویٰ کا عظیم ذخیرہ ہے اور ان کے اقوال و آثار علماءِ اسلام اور فقہا و محدثینِ مدینہ کے نزدیک مختار و پسندیدہ اقوال ہیں کیونکہ مدینۂ منورہ "روح بلاد ودلِ امصار" تھا۔ تمام ممالکِ اسلامی سے علماء و محدثین ہر زمانے میں مدینۂ منورہ آتے اور وہاں کے علماء سے استفادہ کرتے رہے۔ اس سے یہ اصول مسلم ہو گیا تھا کہ علماء و اہلِ مدینہ کے پاس جو علوم منقح ہو جاتے تھے وہ دوسروں کے پاس نہیں ہوتے تھے۔ امام مالک نے حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت ابنِ عباس سے اس بنا پر کم روایت کی ہے کہ وہ مدینہ کے باہر مقیم ہو گئے تھے۔ (المصفیٰ)۔ اسی بنا پر امام مالک کو جب کوئی حدیثِ نبوی نہیں ملتی تھی وہ اہلِ مدینہ کا عرف و روش اختیار کرتے تھے جس کے بارے میں یہ قوی احتمال ہوتا تھا کہ وہ سنتِ نبوی و صحابہ سے مستفاد ہوگا۔ شاہ صاحب نے "المصفیٰ" میں اس بنا پر یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ موجودہ حالات میں طریقِ اجتہاد و فقہ مسدود رہے گا یعنی احکامِ شرعیہ کی تفصیلی دلائل کے ذریعہ معرفت ممکن نہ ہوگی سوائے ایک صورت کے کہ "موطا" کو پیش نظر رکھا جائے۔ (۱۱-۱۰) اسی سبب سے شاہ صاحب اس امر کے قائل تھے کہ جب طالب علم عربی زبان و ادب کی ضروری لیاقت حاصل کر لے تو اسے یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی مرتب کردہ "موطا" پڑھائی جائے اور اس کی تعلیم معطل نہ کی جائے کہ وہی علمِ حدیث کی اصل ہے اور اس کی تعلیم بڑے فضائل کی حامل ہے (وصیت نامہ)۔

اسی بنا پر وہ حدیث کی کتابوں کی درجہ بندی میں "موطا" کو اول اور سرِ فہرست رکھتے ہیں اور درجۂ اول میں اس کے بعد بخاری و مسلم کو۔ درجہ دوم کی کتابیں "جامع ترمذی"، "سنن ابی داؤد" اور "سننِ

نسائیؒ ہیں جبکہ درجہ سوم میں وہ کتابیں ہیں جن میں صحت کا التزام نہیں رکھا گیا جیسے مسندِ ابی یعلیٰؒ، مصنفِ عبدالرزاقؒ، مصنفِ ابی بکر بن ابی شیبہؒ اور کتبِ بیہقی وطبرانی۔ درجۂ چہارم کی کتابوں کا سراغ اولین دور میں نہیں ملتا، البتہ متاخرین نے ان کی روایات لی ہیں جیسے ابنِ حبانؒ کی کتاب الضعفاءؒ، ابن عدیؒ کی کاملؒ، مسندِ خوارزمیؒ اور خطیب بغدادی کی تمام کتابیں۔ آخری دو درجات -سوم و چہارم- کی کتبِ حدیث قابلِ اعتماد و اعتبار نہیں کیونکہ ان میں بہت سی روایات ضعیف ہیں۔ امام ولی اللہ اسی بناپر سننِ ابن ماجہؒ کو بھی ضعیف احادیث کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور اس کی روایات سے استدلال صحیح نہیں سمجھتے۔

کتبِ احادیث کی صحت کے لحاظ سے درجہ بندی نے تحقیقِ حدیث اور تدبرِ آثار کا ایک باب کھولا، صحیح وضعیف کا امتیاز پیدا کیا، معتبر و ناقابلِ اعتبار کی حد بندی قائم کی اور استفادہ کی حدود مقرر کیں۔ اس سے زیادہ اہم کارنامہ یا نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور و سقیم روایات سے سرچشمۂ حدیث کو صاف کیا اور یہ اصول قائم فرمایا کہ صحیح احادیث سے جب اعمال واستنباط کا معیار قائم رکھا جاسکتا ہے تو ضعیف روایات سے استفادہ کیوں کیا جائے اور فِرَق ضالہ، مخالفینِ اسلام اور اعداءِ دین کو کیوں اسلام کے خلاف ہتھیار تھمایا جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اس جماعتِ محدثین کے خلاف اور اس کے شدید ناقد تھے جو علمِ حدیث میں اجتہادی ملکہ اور تحقیقی ذوق کے مالک نہ تھے کیونکہ انھوں نے محققینِ فن سے اس کا علم حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ وراثی مسلک کے عامل اور ملتِ مصطفویہ کے سوفسطائی گروہ تھے کہ نہ وہ تقلید سے ہی پوری طرح وابستہ تھے اور نہ اجتہاد سے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غیر محققینِ حدیث آثار واحادیث کے اختلاف کو دور کرنے اور ان میں تطبیق پیدا کرنے اور صحیح احادیث کو مدون کرنے میں ناکام رہے۔ وہ احادیث کے درمیان صحیح وغیر صحیح کی تمیز نہیں روا رکھ سکے اور لاطائل فقہی اور کلامی مباحث میں الجھ کر رہ گئے۔

نقدِ احادیث میں شاہ ولی اللہ امام بخاری کے مجتہدانہ مقام کے بہت معترف ہیں کہ امامِ موصوف نے صحیح احادیث کو غلط روایات سے الگ اور ممیز کرنے کا معیار اور اصول بنایا۔ اس کے باوجود وہ بعض اصولِ بخاری سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی امر پر اگر دو الفاظ کا احتمال پایا جائے تو ہر دو سے بطور دلیل مسئلہ اخذ کرنا۔ بعض محققین نے اس کو قبول نہیں کیا۔ (مکتوبات، حدیثِ بخاری)۔

ولی اللّٰہی فکر میں بظاہر متعارض احادیث و متصادم روایات میں تطبیق کے اصول کو بہت اہم مقام حاصل ہے اور جس طرح انھوں نے صحاح کی احادیث میں تطبیق کر کے عملاً دکھائی ہے وہ نادر و بے مثال بھی ہے اور فنِ حدیث میں ان کی جلالتِ شان کی دلیل بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ تطبیق کا کام وہی محدثِ فقیہ انجام دے سکتا ہے جو روحِ حدیث سے واقف اور فنِ حدیث میں تبحر علمی رکھتا ہو اور جس کی نظر محض ظاہر الفاظ پر نہ رک جائے بلکہ وہ ہر مسئلہ، معاملہ اور امر کی تہہ تک اتر جائے۔

اسی فنی تبحر اور علمی دراکی کے نتیجہ میں فقہِ حدیث کا علم اور اسرار و رموزِ حدیث کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ سے قبل امام غزالی نے "احیاء العلوم" میں اور عزالدین عبدالسلام نے "القواعد الکبریٰ" میں اور ممکنہ طور سے بعض دوسرے محققینِ حدیث نے اپنی کتب میں فقہ و اسرارِ حدیث کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے لیکن وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ کو اللہ تعالیٰ نے اسرار و رموزِ دین کا پتہ لگانے اور روحِ حدیث کی تہ تک پہونچ جانے کی زبردست صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ ان کی بہت سی کتابوں میں اس علمی دراکی اور تبحر فنی کی مثالیں ملتی ہیں لیکن ان کی شاہ کار تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" اس کا خزانہ ہے۔ دین و معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے اسرار و رموز کو انھوں نے اپنے ناخنِ تدبر سے نہ کھولا ہوا۔

فقہیات

اسلامی فقہ کا بنیادی ماخذ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک صرف قرآنِ مجید ہے اور حدیث قرآنِ مجید کی شرح ہونے کے سبب دوسرا ضمنی ماخذ ہے۔ ان دونوں کے باہمی رشتہ کو سمجھے بغیر فقہ یعنی استنباطِ احکام کا فریضہ نہیں انجام دیا جا سکتا۔ بعد میں اجماع و قیاس کے دو مزید ذیلی اصول کا اضافہ کیا گیا لیکن ان کے لئے یہ شرط رکھی گئی کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوں جیسا کہ سنت و حدیث کے لئے یہ لازم ہے کہ قرآن و روحِ قرآن سے متصادم نہ ہو۔ شاہ صاحب حضرات عمر و عثمان کی فقہی آراء اور خلیفۂ سوم کے زمانے تک صحابۂ کرام کے اتفاق کو اجماعِ امت قرار دیتے ہیں۔ خلیفۂ وقت اگر صحابہ یا اصحابِ دانش کے مشورے اور اتفاق سے کوئی قاعدہ جاری کر دے اور وہ امت کے علماء و عوام میں قبولِ عام حاصل کر لے تو وہ اجماع بن جاتا ہے۔ خلفائے راشدین یا صحابۂ کرام کے اسی اتفاق کو اجماع قرار دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب حضرت فاروقِ اعظم کی

فقہی آراء کو" اجماعیات" کا نام دیتے ہیں۔ بعد کے ادوار میں مجتہدوں اور فقیہوں کی سر کردہ جماعت کے اتفاق کا نام اجماع ہے۔ لیکن ان کا اتفاقِ کلی ناممکن ہے۔ شاہ صاحب کا نظریہ بڑا مفکرانہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم کے دستِ مبارک پر جو اتفاق و اجماع نہ ہو سکا وہ مختلف فیہ مسئلہ رہا اور ہمیشہ رہے گا اور "تاروزِ قیامت" اس پر اتفاق نہ ہو سکے گا۔ اسی بنا پر وہ یہ فرماتے ہیں کہ مذاہبِ اربعہ کی اصل شیخین کی "اجماعیات" ہیں۔ شاہ صاحب نے اسی وجہ سے فقہِ فاروقی جمع کر کے "ازالۃ الخفا" میں شامل کر دی کہ وہ تطبیقِ مذاہب اور اجماعِ امت کی ایک صورت و مثال فراہم کرتی ہے۔

عہدِ اول میں شخصِ واحد کی تقلید کا تصور بھی نہ تھا۔ شاہ صاحب اسی بنا پر "انتباہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اول زمانے میں "کتب، موطات، تالیفات، مسانید، جوامع کی شکل میں مسائل مدون کرنے کا دستور نہ تھا تا آنکہ امام مالک بن انس نے اپنی "موطا" تحریر کر ڈالی۔ اس نے ایک فقہی مسلک کی بنا ڈال دی۔ شخصِ واحد کی آراء و فتاویٰ کو امتِ مسلمہ کے تمام افراد کے لئے لازم نہ کرنے یا تقلیدِ فرد کا اصول نہ قائم کرنے کی حقیقت امام مالک کے بھی پیشِ نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خلیفہ عباسی المنصور کے اصرار کے باوجود "موطا" کو پوری مملکتِ اسلامی کے لئے لازمی و دستوری کتاب بننے کی اجازت نہیں دی تھی۔

لیکن تیسری صدی ہجری میں یا زیادہ سے زیادہ دوسری صدی ہجری کے اختتام کے وقت سے متعین مجتہد کی تقلید اور اس کے اصولِ فقہی کو راہنما خطوط بنانے کا قاعدہ چل پڑا اور اس بنا پر مستقل مجتہد وجود میں آگئے اور ان کے مسالکِ فقہ بھی۔ یہیں سے تقلیدِ مذہب کا طریقہ شروع ہوا اور چوتھی صدی ہجری سے وہ لازمی ہو گیا کہ مستقل مجتہدینِ کرام کا طبقہ بھی ختم ہو گیا۔ اب مجتہدین فی المذہب یا بقول شاہ ولی اللہؒ "مجتہدِ منتسب" پیدا ہونے لگے اور ان کا وجود قیامت تک کے لئے ہو گیا۔ تاہم اجتہاد ہر دور میں فرضِ کفایہ رہے گا کیونکہ اس کا منقطع ہونا شرعی صورت سے جائز نہیں ہے۔

اگرچہ شاہ ولی اللہ کی فطرت تقلیدِ جامد یا شخصی تقلید سے فطری طور سے ابا کرتی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے ملکی مذہبِ فقہ - حنفی - کی نہ صرف خود پابندی کی، نہ صرف اصول میں بلکہ فروع میں بھی، بلکہ اسی کی تعلیم و تدریس اور تبلیغ و ارشاد کرتے رہے۔ اس کی بنیادی وجہ مصلحتِ وقت نہیں تھی بلکہ امتِ مسلمہ ہندیہ کی ضرورت و اجتماعیت تھی۔

شاہ موصوف کی بنیادی فکر یہ تھی کہ فقہِ اسلامی کا بنیادی سر چشمہ "موطا امام مالکؒ" ہے اور نتیجتاً فقہِ مالکی یا مسلکِ مالکی تمام مسالکِ فقہ بالخصوص مذاہبِ اربعہ کا منبع ہے کیونکہ حنفی فقہ کے سب سے بڑے مرتب و مولف امام محمد بن حسن شیبانی (۱۳۲ھ / ۷۴۹ء - ۱۸۹ھ / ۷۹۶ء) اور فقہِ شافعی کے سب سے بڑے امام محمد بن ادریس شافعی (۱۵۰ھ / ۷۶۷ء - ۲۰۴ھ / ۸۲۰ء) دونوں امام مالک کے شاگرد تھے اور دونوں نے ان سے 'موطا' کا درس لیا تھا اور 'موطا' ہی ان کی فقہی آراء اور ان کے مسالک کی بنیاد بنی تھی۔ ان دونوں میں محض چند فروع کا اختلاف پایا جاتا ہے ورنہ بنیادی طور سے اصولیات میں وہ متفق ہیں اور یہ اختلاف ان کے اپنے اپنے اجتہادات اور ان کے نتیجہ میں یکساں امور و مسائل میں جداگانہ طرزِ فکر اور فکری رویہ اپنانے کے سبب پیدا ہوا ہے۔ فقہی جمود اور کٹرپن مسلکی عصبیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر صحیح نیت، صحیح علم اور اجتہاد کی صحیح قوت ہو اور اصل کتاب و سنت کی طرف صحیح طریقہ سے رجوع کر کے مسائل و امور کا استنباط کیا جائے تو یہ فروعی اختلافات بھی دور کئے جا سکتے ہیں۔

شاہ صاحب کی معرفتِ حدیث و فقہ نے ان پر یہ حقیقت بھی ظاہر کر دی تھی کہ حق چاروں مسالکِ فقہ - مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی - میں دائر، موجود اور خون کی طرح گرداں ہے (عقد الجید ۹۳ و مابعد)، صرف احسن یا بہتر نقطۂ نظر اور صحیح تر عمل کی بات ہے اس لئے وہ ان چاروں مذاہب سے باہر جانے کا خیال بھی نہیں لاتے تھے اور لوگوں کے لئے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ وہ انہیں چاروں فقہی مسالک میں سے کسی نہ کسی کی اتباع ضرور کریں۔ البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ جہاں اور جب حق نظر آجائے اور ثابت ہو جائے تو اسے قبول کر لیں اور محض مسلکی تشدد و عصبیت کی وجہ سے اس پر نہ اڑے رہیں کیونکہ تمام امامانِ فقہ کا یہی نظریہ، فکر، مسلک اور رویہ رہا ہے۔

جب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حق چاروں مذاہب میں دائر ہے اور ان میں اختلاف اور وہ بھی فروعی حسنِ نیت و حسنِ فکر کی بنا پر پایا جاتا ہے تو شاہ ولی اللہ کے دل میں تطبیق کی آرزو جاگی جو ان کے فکر و نظر اور حکمت و فلسفہ کی ایک اہم صورت تھی۔ وہ چاروں مذاہب کے اختلاف ظاہری کو دور کرنے کی سبیل نکالنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ عالم اسلام بالخصوص برِ صغیر پاک و ہند کے پس منظر میں انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ حنفی اور شافعی مسالک کو سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل ہے کہ ان کی کتبِ فقہ بھی سب سے زیادہ ہیں، ان کے علماء اور مجتہدین بھی اکثریت میں ہیں اور ان کے

پیرو اور مقلدین بھی لہذا یہ بات ملاءِ اعلیٰ کے علوم کے عین مطابق ہے کہ حنفی اور شافعی مسالک میں ممکنہ طور سے مطابقت پیدا کی جائے۔ ان دونوں کے ان تمام آراء و فتاویٰ کو باقی رکھا جائے جو از روئے حدیث و قرآن ثابت و مسلم ہیں اور ان سے اجتناب و گریز کیا جائے بلکہ ان کو سرے سے ختم کر دیا جائے جو بے اصل ہیں۔ دونوں کے باہمی اختلاف کو دور کرنے کے لئے "موطا امام مالک" کو ثالث و حکم بنایا جائے کہ وہ نہ صرف ان دونوں مسالک کا سر چشمہ ہے بلکہ اس دورِ آخر میں وہی اجتہاد کا دروازہ کھولنے والی کتابِ فقہ ہے (تفہیمات ۲/۲۲)

حنفی فقہ سے صورتِ تطبیق یوں اخذ کی کہ ائمۂ ثلاثہ -ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد بن حسن- میں سے جس امام کا قول سنت کے قریب تر ہو اسے اختیار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اہلِ تحقیق ہی کر سکتے ہیں جن کی فطرت میں تحقیقِ صحیح کا مادہ ہے اور اختلاف و فساد سے گریز کی صلاحیت بھی۔ عوام الناس نہ فقیہ ہوتے ہیں نہ مجتہد، وہ اپنے اپنے فقیہوں کے پیرو ہوتے ہیں لہذا ان کے فقہی خیالات کو چھیڑا نہ جائے۔ جب فقیہانِ مسلک اور مفتیانِ ملت اپنی مسلکی عصبیت کو چھوڑ کر "حق و صواب" کی بات کہیں گے تو وہ اہلِ تحقیق و معرفت کے طبقہ سے چھن کر عوام کے طبقات تک پہونچے گی اور بلا فساد و اختلاف ان کے اندر جاگزیں ہو جائے گی جیسے کہ وہی ان کی فقہ، مسلک اور مذہب ہے۔ شاہ صاحب نے اولین مجتہدین کے اقوال و اصول اور متاخر فقہاء کے اقوال و آراء میں فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ توجہ مجتہدینِ اولین کے اقوال پر رکھی جائے نہ کہ متاخرین پر جو اپنے فکر و نظر کے لحاظ سے ائمۂ اولین کے اقوال سے اپنی آراء مستنبط کرتے ہیں۔

شاہ صاحب نے اپنی تطبیقی کتاب "الانصاف" میں اور "ازالۃ الخفاء" میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے فقہی اختلافات کو دور کرنے اور مختلف مذاہب کے افکار و مسائل میں تطبیق پیدا کرنے کے اصول اور طریقے بتائے ہیں۔ حنفی فقہ کے تعلق سے انھوں نے واضح کیا ہے کہ اصل مذہبِ حنفی متاخرین کی کتابوں میں محدود و موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اصولِ فقہ، جو بزدوی وغیرہ کتبِ اصولیات میں موجود ہیں، بعد کے فقیہوں نے ائمۂ اولین کے اقوال و افکار کی روشنی میں وضع کئے ہیں جن کا وجود اصل اماموں کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح فقہاء بعض اوقات شریعت اور مصلحت میں امتیاز نہیں رکھ پاتے حالانکہ شریعت کے احکام ازلی و ابدی ہیں اور مصلحت کے علم میں بہت سی انسانی مفسدات شامل ہو جاتے ہیں۔ شارع نے تو دونوں علم عطا فرمائے تھے لیکن فقہاء

پر کبھی ایک اور کبھی دوسرا علم مشتبہ ہو جاتا ہے اور وہ غلط نتائج تک لے جاتا ہے۔ ''الانصاف'' میں متعدد فقہی مسائل کی سنت و قرآن کے اعتبار سے حقیقت بیان کی ہے۔ ان کا اصل زور اس بات پر ہے کہ جہاں سنت و حدیث اور قرآن کا حکم مل جائے اس پر لفظاً و معناً عمل کیا جائے اور حدیث و قرآن کے حکم کو ذاتی رائے سے محدود، مشروط یا آلودہ نہ کیا جائے۔

احسان و تصوف

قرآنِ کریم اور حدیثِ شریف کی اصطلاح میں دین کی روح و مغز کا نام احسان و تزکیہ ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ان دونوں کا استعمال کیا گیا ہے اور ان کے عاملین کو محسنین اور طاہرین کہا گیا ہے۔ حدیثِ جبریل میں احسان کی تعریف یوں آئی ہے کہ انسان عبادتِ الٰہی کے وقت اس حال و مقام کا حامل ہو کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیدارِ الٰہی کر رہا ہو اور اگر یہ مقامِ مشکل اسے حاصل نہ ہو تو کم از کم اس احساس و شعور کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرے کہ اللہ تعالیٰ تو بہر حال اسے دیکھ ہی رہا ہے۔ عبادتِ الٰہی کا مفہوم تمام مومنانہ زندگی کو حاوی ہے، صرف نماز، روزہ یا معروف عبادات تک محدود نہیں۔ بقول شاہ ولی اللہ دہلوی ''آج کل احسان کا نام طریقت و معرفت ہے''۔ (قرۃ العینین، ۴۲) یا عام اصطلاح میں اسے سلوک و تصوف اور اس کے عاملین کو سالکین و صوفیہ کہتے ہیں (القول الجمیل)۔ اس علم کو علم باطن بھی کہا جاتا ہے (الانتباہ)

اسی بنا پر احسان و تزکیہ، طریقت و معرفت کا رشتہ رسولِ اکرم ﷺ، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، علمائے امت اور تمام اکابر و صلحاءِ عہدِ اول سے جڑ جاتا ہے۔ آدابِ سلوک اور رسومِ طریقت بھی سنتِ طاہرہ اور طریقتِ اسلاف سے ماخوذ و مستفاد ہیں۔ طریقت شریعت سے الگ ہے اور نہ شریعت طریقت سے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں میں جسم و روح کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ عہدِ اول سے قائم ہے۔

بیعت و ارشاد، خرقۂ تصوف اور دوسری رسومِ تصوف بلکہ خود لفظ و اصطلاحِ تصوف دوسری صدی ہجری سے شروع ہوئی۔ شاہ صاحب تاریخی طور سے صوفی طریق اور تصوف کو حضرت حسن بصری کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ سے جاری ہونے اور انھیں پر محدود منتہی ہونے کے قائل نہیں کیونکہ بہت سے صوفیہ بھی حضرت علی مرتضٰی سے سلسلۂ تصوف کے استناد کو صحیح نہیں سمجھتے اور حضرت حسن بصری کا حضرت علی سے اتصال بھی قابلِ

بحث ہے تاہم اجماعِ صوفیہ کو ایک حقیقتِ ثابتہ مانتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں کہ "طبقہ بہ طبقہ کے بعد ان کا قاطبۃً یا حتماً اجماع" اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور رکھتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک صوفیہ اس امت کے مجذوب ہیں اور امتِ محمدی میں پہلی بار کسی نے یہ بابِ جذب کھولا ہے یا "فاتح بابِ جذب" ہے وہ حضرت علی ہیں۔ لہٰذا تمام سلاسل و طُرق اس بنا پر ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (قرۃ العینین، ۹۹-۲۹۸؛ ۳۰۷-۳۰۲؛ ہمعات، ۳۱)

تاریخِ تصوف کو شاہ صاحب نے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے: (۱) پہلی صدی جس میں احسان تصوف کا حاصل تھا (۲) حضرت جنید بغدادی سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں تعلق باللہ کی نسبت کے حصول پر زور تھا (۳) شیخ ابو سعید ابو الخیر اور شیخ ابو الحسن خرقانی کا دور جب صوفیہ اعمال و احوال سے گذر کر جذب تک پہونچے (۴) اور آخری شیخِ اکبر ابن عربی (۱۷ رمضان ۵۶۰ھ / ۲۸/ جولائی ۱۱۶۵ء -- ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) کا دور جس میں حقائقِ تصوف پر زیادہ توجہ کی گئی (ہمعات ۹-۷)۔ شاہ صاحب نے صوفی نسبتوں کی تعداد سات بتائی ہے، صحابہ، تابعین اور جمہورِ صالحین کی نسبت احسان ہے، صوفیۂ متقدمین کی عشق و وجد، شیخ جیلانی کی اویسی، نقشبندیہ کی عشق و نور و طہارت کا مجموعہ، سہروردیہ کی نور و طہارت و سکینہ اور کبرویہ کی توحید و عشق و وجد (ہمعات ۴۳)

فکرِ ولی اللٰہی میں طریقت و معرفت یا سلوک و تصوف کی دو الگ الگ سطحیں ملتی ہیں۔ ایک فلسفۂ تصوف ہے جو اصولی، ماورائی اور نظریاتی بحث کرتا ہے۔ اس کا سوتا صوفی فلاسفہ کے نظریات و افکار اور خیالات سے پھوٹتا ہے اور دوسرا عام رسوم و آداب اور اعمال و اشغالِ تصوف سے متعلق ہے جن کی تفصیلات و تشریحات صوفی سلسلوں -- نقشبندی، قادری، چشتی سہروردی، شطاری، شاذلی وغیرہ -- کے معمولات، کتابوں اور طریقوں میں ملتی ہیں۔ ان دونوں سے صوفیہ اور رہروانِ سلوک کو احوال و مقامات سے بہرہ مندی حاصل ہوتی ہے۔ شاہ صاحب یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ انسان کے جوارح کی تہذیب اور اس کے لطائف کی اصلاح اعمالِ شریعت سے ہوتی ہے نہ کہ احوال و مقامات سے، لہٰذا مطلوب و مقصود شرع کے سوا اور کچھ نہیں کہ صُورِ نوعیہ اسی کا تقاضا کرتی ہیں۔ لیکن انسان کا نفسِ امارہ اسے ہلاکتِ دنیا و آخرت تک لے جا سکتا ہے اس سے بچانے کی صورت شریعت اور طریقت کا اجتماع ہی کر سکتا ہے۔ (الطاف القدس ۲۵-۲۴)

قلسفیانہ تصوف صرف اہلِ علم اور اہلِ دل کے لئے خاص ہے جبکہ عام اعمال و رسوم و

اشغالِ تصوف سب کے لئے عام ہیں۔ان کے فلسفۂ تصوف پر ابن عربی کے وحدۃ الوجود، مجددِ الفِ ثانی کے وحدۃ الشہود اور متعدد دوسرے فلاسفہ و حکمائے اسلام کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ شاہ صاحب کا نظریہ ہے کہ انسان میں دو متصادم قوتیں- قوتِ ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ -کار فرما ہیں۔ان کے علاوہ صوفیہ کے بقول باطنِ انسان میں تین لطائف -لطیفۂ عقل، لطیفۂ قلب اور لطیفۂ نفس -پائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ایک چوتھے "لطیفۂ جوارح" کا اضافہ کیا ہے۔ان لطائف کی حد بندی اور اصلاح میں اور قوتِ ملکیہ کے حاوی ہونے میں انسانی سعادت مضمر ہے۔ پھر انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہے: جسم جو اس کے نسمہ (روحِ ہوائی) کا مرکب ہے اور نسمہ نفسِ کلیہ سے وابستہ ہے۔ نفسِ کلیہ حظیرۃ القدس سے فیضانِ علوم حاصل کرتا ہے جو ذاتِ الٰہی کی تجلیٔ اعظم سے وہاں منعکس ہوتے ہیں۔اس لئے انسان ملاءِ اعلیٰ اور ان کے حظیرۃ القدس سے اتصال چاہتا ہے مگر بہیمی قوتیں اسے روکتی یا دور رکھتی ہیں۔ تجلیٔ اعظم نے ان کی اصلاح کے لئے انبیاء کو مترجمینِ غیب بنا کر بھیجا جو ان کی دونوں قوتیں درست رکھیں اور قوتِ ملکیہ کو غلبہ دیں۔اس لئے رسولوں اور نبیوں کی لائی ہوئی شریعت کی اتباع لازمی ہے۔ دنیا سے جب انسان جاتا ہے تو اس کا جسم یہیں رہ جاتا ہے جبکہ اس کا نسمہ باقی رہتا ہے اور نفسِ کلیہ سے متصل بھی۔ قیامت کے دن اس نسمہ کو جسمانی مرکب عطا کیا جائے گا اور پھر وہ اپنے نسمہ و نفسِ کلیہ کے ساتھ جنت یا جہنم جائے گا۔ جنت میں نسمہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جائے گا اور صرف نفسِ کلیہ رہ جائے گا جو حظیرۃ القدس سے وابستہ ہو جائے گا۔ ذاتِ الٰہی وراء الوراء ہے یا "ذاتِ بحت" جس کا ادراک ناممکن ہے، صرف اس کی تجلیات کا شعور و احساس کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو اصل اور بنیادی مانتے ہیں جیسا کہ ان کے والدِ ماجد شیخ عبد الرحیم کا نظریہ و خیال تھا اور مجددِ الفِ ثانی کے نظریہ وحدۃ الشہود کو وحدۃ الوجود کا ایک پہلو اور اس میں موجود تسلیم کرتے ہیں اس لئے دونوں کے اختلاف کو لفظی نزاع جانتے ہیں (مکتوب مدنی؛ التفہیمات الالٰہیہ، اول، ۱۹، ۱۸۸؛ الطاف القدس، ۱۰۵)۔

شاہ صاحب کا فلسفۂ تصوف ان کی کتابوں "ہمعات"، "سطعات"، "الطاف القدس"، "فیوض الحرمین"، "مکاتیب" بالخصوص "مکتوبِ مدنی"، "تفہیماتِ الٰہیہ"، "انفاس العارفین"، "البدور البازغہ" وغیرہ کے علاوہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں بھی ملتا ہے۔ بلجان، جلبانی، سندھی اور محمد فاروق قادری وغیرہ نے جدید انداز میں اس پر کافی لکھا ہے۔

عملی تصوف میں شاہ ولی اللہ اپنے والدِ ماجد کی مانند نقشبندی طریقہ کی طرف زیادہ رجحان رکھتے تھے کیونکہ اس میں توحیدِ الٰہی اور خالص اسلامیت کا رنگ چوکھا ہے اور بدعات وانحرافات سے گریز پایا جاتا ہے۔ دوسرے سلاسل کے بھی جامع اور ان میں بیعت تھے اور ان کے اذکار، اشغال اور اعمال پر عامل۔ وہ بعض رسوم و آداب اور طریقوں پر بھی عمل کرتے تھے یا ان پر عمل کرنے کے قائل تھے جیسے فاتحہ، عرس، ختم، زیارتِ قبور وغیرہ مگر ان کے لئے وہ کتاب وسنت کی پابندی لازمی جانتے تھے اور بدعات وانحرافات اور جاہل صوفیہ کے طور طریقوں کے سخت ناقد بھی تھے۔ انھوں نے صوفیہ کے لئے کتاب وسنت اور شریعت کی اعلیٰ تعلیم وتربیت اور علمی تبحر کو ضروری قرار دیا تھا۔ جاہل صوفیہ کی بدعات کو ختم کر کے طریقت و معرفت کی صحیح راہ دکھائی تھی اور سرچشمۂ تصوف کو گندگی سے صاف کیا تھا۔

دیگر علوم وفنون

شاہ صاحب کی فکر وحکمت کی جولانیاں بعض دوسرے علوم وفنون کے بیان میں بھی نظر آتی ہیں۔ یہاں سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے لہذا مختصراً سیرتِ نبوی، تاریخِ اسلامی، سیاسیات اور تہذیب وسماجیات کے باب میں چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سیرتِ نبوی: اگرچہ سیرتِ نبوی پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں فرمائی تاہم "حجۃ اللہ البالغہ" کے ایک باب میں مختصر سیرت نگاری کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اور اس کے مختلف ابواب اور دیگر تصانیف میں حکمتِ سیرت کے جواہر بکھیرے ہیں۔ ان کی فکرِ سیرت میں سلسلۂ انبیاء کی تدریجی تکمیل اور آفاقیت کا واضح تصور ملتا ہے۔ نبوت و رسالت کے اصولی مباحث میں انداز فلسفیانہ ہوتا ہے اور بیانِ واقعاتِ سیرت میں مورخانہ۔ مصادرِ سیرت سے زیادہ روایاتِ حدیث سے بیانیہ سنوارتے ہیں۔ ماہ وسال اور تاریخ ویوم کے حوالے کے بغیر سوانح نبوی اور واقعاتِ عہد میں محض اپنی تنظیم وترتیب کے ذریعہ تاریخی نظم پیدا کر دیتے ہیں۔ واقعات اور تاریخی حوادث سے زیادہ ان کے پیچھے اسبابِ غیب کی کار فرمائی سے تعرض کرتے ہیں۔ اسرار ورموز تلاش کرنے کے سبب معجزات وخوارق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سلسلۂ نبوت کے مانند وہ خلافتِ اسلامی کو نبوتِ محمدی کی توسیع اور جانشینی بتاتے ہوئے تہذیبِ اسلامی کی آفاقیت اور دینِ اسلام کے تواتر کو اجاگر

کرتے ہیں۔ غزوۂ خیبر کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کی خلافتِ الٰہی کے قیام کا نظریہ پیش کرتے ہیں جبکہ جزیرۂ نمائے عرب پر آپ ﷺ کی حکومت کو تکمیلِ خلافتِ نبوی قرار دیتے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ، باب سیر النبی ﷺ)

تاریخ و خلافتِ اسلامی: تدفینِ نبوی سے قبل حضرت ابو بکر صدیق کی خلافت کے آغاز کو خلافتِ نبوی کی جانشینی اور رسالتِ محمدی کے تسلسل کا مبہم حوالہ تو دوسرے صاحبانِ فکر کے ہاں بھی مل جاتا ہے مگر شاہ ولی اللہ ختمِ نبوت کی تکمیل کے بعد کارِ نبوت کے تسلسل اور توسیع کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ بالخصوص خلافتِ شیخین کو خلافتِ محمدی کی تکمیل بتاتے ہیں اور بقیہ ادوار میں اس کی توسیع کا عمل دیکھتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ عہد بہ عہد نبوتِ محمدی کی تکمیل بن جاتی ہے۔ خلافتِ عامہ کے اصولی مباحث میں وہ شرائط، صفات اور خصوصیات کو زیرِ بحث لاتے ہیں جبکہ خلافتِ خاصہ میں وہ خلافتِ ثلاثہ (حضرات ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم) کے واقعات کے علاوہ یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ وہ خلافتِ خاصہ اور خلافتِ مجتمعہ تھی۔ چوتھے دورِ خلافت کو صحیح نبوی خلافتِ راشدہ قرار دینے کے باوجود اسے غیر متفقہ یا غیر اجماعی سمجھتے ہیں۔ بعد کے ادوارِ خلافت کا تجزیہ احادیثِ نبوی، اعمالِ خلفاء، واقعاتِ عہد اور افکارِ علماء و محدثین کے حساب سے کرتے ہیں۔ اموی اور عباسی خلافت کے بعض غیر اصولی اور غیر اسلامی عناصر پر نقد کرنے کے باوجود ان دونوں ادوار کو دائرۂ خلافت سے خارج نہیں قرار دیتے کیونکہ اولین کے بارے میں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ بارہ خلفاءِ اسلام تک دین و مذہب معزز رہے گا اور یہ سب کے سب اموی تھے جبکہ عباسی خلافت کے بارے میں نبوی پیشگوئیاں ملتی ہیں (ازالۃ الخفاء) اسلامی خلافت کو ظاہری خلافت قرار دیتے ہیں اور ائمۂ اطہار، علمائے کرام اور مولفینِ عظام کی علمی خدمات کو خلافتِ باطنی۔ اسی سبب سے اپنے آپ کو خلافتِ باطنی پر سرفراز، نائبِ یوسفؑ اور قائم الزماں وغیرہ قرار دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ نئے دور کا آغاز اور علوم کا احیا کرنے والے تھے۔

سیاسی اور سماجی افکار: خلافتِ اسلامی سے متعلق اصولی مباحث اور واقعاتی استدلالات شاہ صاحب کی سیاسی فکر کو واضح کرتے ہیں۔ حکمران یا خلیفہ کا اعلیٰ نسب سے ہونا اس کے محبوب و مطاع ہونے کی ضمانت فراہم کرتا ہے جس طرح اس کے ذاتی اوصافِ شجاعت و شہامت،

ذہنی قوتِ فیصلہ، اجراءِ حکم کی طاقت، نفاذِ شریعت اور اطلاقِ قانون کی صلاحیت، جہاد کے جاری رکھنے کی شہامت اور بالکلیہ اسلام کے دفاع و بقاء اور ترویج و تکمیل کی لیاقت اور مسلم معاشرہ کی اجماعیت قائم رکھنے کی حکمت کرتی ہے۔ شاہ صاحب کے سیاسی افکار خلافتِ راشدہ و اسلامیہ کے تناظر میں ملتے ہیں۔ "ازالۃ الخفاء" میں بالخصوص اور بعض نگارشات میں بالعموم اصولی بحثیں کی گئی ہیں۔

سماجیات پر شاہ صاحب کا سب سے اچھوتا نظریہ اور مبحث "ارتفاقات" کے باب میں ملتا ہے اور غالباً امامِ سماجیات و اجتماعِ بشری ابنِ خلدون کے بعد شاہ صاحب کی بحث سب سے زیادہ مدلل، نادر اور شاندار ہے۔ انسان ایک سماجی فرد ہے اور وہ اپنی بعض مخصوص سماجی اور اقتصادی ضروریات رکھتا ہے۔ ان کی تلاش و جستجو اور تکمیل کے چار مراحل ہیں جن کو وہ "ارتفاقات" کا نام دیتے ہیں۔ ارتفاقِ اول میں انسانی افراد بنیادی ضروریات – کھانا، کپڑا اور مکان – کو اپنے طبعی و فطری ملکات و اوصاف کی بنا پر پورا کرتے ہیں۔ وہ غذا کی فراہمی کاشتکاری یا حیوانات کے ذریعہ کرتے ہیں اور انھیں سے مکان کی ضروریات کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔ جنسی خواہش کی تسکین کے ذریعہ اپنی نسل کی بقا کا سامان فراہم کرتے اور دوسروں کی مزاحمتوں سے اپنا دفاع کرتے ہیں۔ شہد کی مکھی کی طرح وہ فطرت سے کام لیتے ہیں۔ اس میں اپنے سوا دوسروں کی رفاہ اور بھلائی کا احساس بھی ہوتا ہے لہٰذا وہ سود مند اور نافع کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے اخلاق کی تکمیل اور نفس کی تہذیب کر کے اپنے لئے عزت و افتخار حاصل کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ اپنے فطری احساسِ جمالیات کے تحت خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان میں ایجاد و تقلید کا مادہ بھی ودیعت ہوتا ہے جس کی بنا پر حاکم و محکوم بنتے ہیں اور سیاستِ مدینہ کی بنا پڑتی ہے۔ تقلید معاشرتی اتفاق و اجتماع کو پیدا کرتی ہے اور عقلمند و دانا اور سادہ لوح افراد اجتماع کو متمدن و مہذب بناتے ہیں۔ اسی ارتفاقِ اول کے مرحلہ میں اجتماعِ بشری اور انسانی معاشرت پیدا ہوتی ہے۔ ارتفاقِ دوم میں ارتفاقِ اول کے مسائل و معاملات کو صحیح تجربات کی صورت میں ڈھالا جاتا ہے تاکہ نفع کی شرح زیادہ سے زیادہ اور نقصان کی کم سے کم ہو۔ اجتماعیت اور تہذیبِ انسانی کے آداب و معیارات قائم کئے جاتے ہیں اور ان کو بہتر سے بہتر بنایا جاتا ہے۔ حرام و حلال، خراب و صحیح، نفاست و شرافت کے اصول بنائے اور برتے جاتے ہیں۔ طہارت و جسمانی نظافت کا شعور و عمل جنم لیتا ہے۔ اسے تدبیر منزل یا معاشرتی زندگی کو مہذب بنانے کا مرحلہ کہتے ہیں۔ مرد و زن، زوجین، اولاد، والدین، آقا و غلام، ملکیت و ملوکیت

کے آداب برتے جاتے ہیں اور باہمی تعامل اور رفاقت کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ تدبیر منزل سے جب شہری تمدن کی منزل آتی ہے تو ارتفاقِ سوم کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ سیاستِ مدن کا عہد و مرحلہ ہوتا ہے جب مختلف شہروں کے باشندے باہمی تعلقات کی رعایت کرکے ملک گیر اور ایک قوم ہونے کا تصور و ادراک و عمل پیدا کرتے ہیں اور یہ قومی ملکی منزل یا اجماعیت کا عہد ہوتا ہے اور چوتھے ارتفاق میں انسانی معاشرہ بین الاقوامی تعلقات اور نافع و سودمند روابط کے دور میں داخل ہوتا ہے اور وہ عالمی نظام اور آفاقی تمدن کی منزل ہے۔

حرفِ آخر

حکمتِ ولی اللٰہی کی ذہنی تشکیل ان کی تعلیمی و تدریسی زندگی سے ہونی شروع ہوئی تھی جو بالآخر ان کی تالیفات و تصنیفات میں ہویدا ہوئی۔ ان کے ادوارِ تالیف سے قطعِ نظر، ان کا تدریجی ارتقاء ہوتا رہا، جس کے عمل کی صحیح تفہیم نہ ہونے کے نتیجہ میں بسا اوقات تناقضِ افکار و تصادمِ آراء کا رنگ بھی ظاہر آنکھوں کو نظر آتا ہے۔ شاہ صاحب کی فکر و حکمت میں ایک اہم عنصر تکرار کا ملتا ہے بالخصوص طریقت و معرفت اور فلسفہ و تصوف کی ان تصانیف میں جو مخصوص عناوین و مضامین کے تحت مرتب نہیں کئے گئے لیکن وہ بہر حال فکر و حکمت کے نئے زاویے اجاگر کرتے اور مکرر ارشادات کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔ "حجۃ اللہ البالغہ"، "ازالۃ الخفاء" اور ایسی تصانیف جو مرتکز مباحث رکھتی ہیں تکرارِ افکار و خیالات سے تقریباً خالی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی فکر و حکمت میں بہر کیف امتزاج، ندرت اور جامعیت کے شاندار عناصر ملتے ہیں۔ امتزاج علمی اسلاف کے افکار و آراء سے، ندرت ان کی اپنی عطایائے خاص کی اور جامعیت پورے علمی اسلامی وراثت کی۔ یہی تینوں شریعت و طریقت کے علوم و فنونِ ولی اللٰہی کی رگ و پے میں جاری و ساری ملتے ہیں جو خالص فکرِ اسلامی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اسی بنا پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ادراک حتمی تھا کہ ان کے علوم و فنون کائناتِ علم میں باقی رہیں گے اور ان کے زمانے سے آج تک اس کی تصدیق و تائید فکری تحقیقات سے ہوتی چلی آرہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی کیونکہ جب بھی شریعت و طریقت کے علوم و فنون کا علمی فکری تجزیہ کیا جائے گا حکمتِ ولی اللٰہی کی طرف رجوع ناگزیر ہوگا۔ فللہ الحمد فی الاولیٰ والآخرۃ ۔ ربنا تقبل منا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

اہم ثانوی کتابیں

ابوالحسن علی حسنی ندوی	تاریخِ دعوت وعزیمت، مجلسِ تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو ۱۹۸۴ء، جلد پنجم
اسمٰعیل گودھروی	شاہ ولی اللہ دہلوی، لاہور غیر مورخہ
اطہر عباس رضوی	شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمز (انگریزی)، کینبرا ۱۹۸۰ء
بقا مظہر	اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہ، اسلام آباد ۱۹۷۹ء
بلجان، جے، ایم، ایس	ریلجن اینڈ تھاٹ آف شاہ ولی دہلوی (انگریزی)، لائیڈن ۱۹۸۶ء
جلبانی، غلام حسین	لائف آف شاہ ولی اللہ (انگریزی) لاہور ۱۹۷۸ء
	شاہ ولی اللہ کی تعلیم لاہور ۱۹۹۹ء
سندھی، عبید اللہ مولانا	شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ لاہور ۱۹۹۸ء
	شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، لاہور ۱۹۷۰ء
	شاہ ولی اللہ اور قرآن وحدیث، دہلی غیر مورخہ
گیلانی، مناظر احسن مولانا	تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد ۱۹۴۸ء
محمد رحیم بخش دہلوی	حیاتِ ولی، مکتبہ طیبہ، لاہور ۱۹۷۲ء
مضطر، اے، ڈی	شاہ ولی اللہ: اے سینٹ اسکالر آف مسلم انڈیا، اسلام آباد ۱۹۷۹ء
مظاہری، عبد القیوم	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، کانپور ۱۹۶۷ء

مولف کی تصانیف

(۱)- خلجی خاندان، اردو ترجمہ، ہسٹری آف دی خلجیز، مولفہ کے، ایس، لال، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء؛ ۱۹۹۸ء

(۲)- عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں، ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۸۴ء

(۳)- عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت،، ادارہ فروغ اردو، لاہور (نقوش، رسول نمبر ۵، ۱۲) ۱۹۸۴ء؛ القاضی پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۸۸ء

(۴)- نبوی غزوات و سرایا کی اقتصادی اہمیت، ادارہ فروغ اردو، لاہور (نقوش، رسول نمبر ۱۱) ۱۹۸۴ء

(۵)- الهجمات المغرضه على التاريخ الاسلامى (عربی)، دارالصحوہ، قاہرہ ۱۹۸۸ء

(۶)- قضايا كتابة التاريخ الاسلامى و حلولها (عربی) الجامعہ السلفیہ، وارانسی ۱۹۸۹ء

(۷)- تاریخ تہذیب اسلامی (جلد اول)، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی ۱۹۹۴ء

(۸)- تاریخ تہذیب اسلامی (جلد دوم)........................ نئی دہلی ۱۹۹۸ء

(۹)- تاریخ تہذیب اسلامی (خلافت عباسی- جلد سوم)............ نئی دہلی ۲۰۰۰ء

(۱۰)- تاریخ تہذیب اسلامی (مسلم اندلس- جلد چہارم)............ نئی دہلی (زیر طبع)

(۱۱)- تاریخ تہذیب اسلامی (مسلم صقلیہ و شمالی افریقہ- جلد پنجم)...... نئی دہلی (زیر طبع)

(۱۲)- عہد نبوی کا نظام حکومت، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ ۱۹۹۴ء؛ الفیصل پبلشرز، لاہور ۱۹۹۵ء

(۱۳)- اللہ اپنے کلام میں، ادارہ فروغ اردو (نقوش قرآن نمبر ۱)، لاہور ۱۹۹۸ء

(۱۴)- اندلس میں علوم قراءت کا ارتقاء، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۹۸ء

(۱۵)- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم -- حمد اولین، ادارہ فروغ اردو (نقوش قرآن نمبر ۲) لاہور ۱۹۹۸ء

(۱۶)- تفسیر سورۃ الحمد -- عبد بہ عبد، ادارہ فروغ اردو (نقوش قرآن نمبر ۲) لاہور ۱۹۹۸ء

(۱۷)-سورۃ الحمد کی تفسیر ربانی،ادارہ فروغ اردو (نقوش، قرآن نمبر۱) لاہور۱۹۹۸ء

(۱۸)-غزوات نبوی کی اقتصادی جہلت، ادارہ مطالعات اسلامی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۹۹ء

(۱۹)- تاریخ اسلامی پر فکری یورش،ادارہ فروغ،لاہور(زیر طبع)

(۲۰)-شاہ ولی اللہ کا فلسفہ سیرت،ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۰۰ء

(۲۱)-بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات،ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی ،علی گڑھ ۲۰۰۱ء

(۲۲)-توحید الٰہی اور مفسرین کرام،(نقوش قرآن نمبر ۳) لاہور ۲۰۰۱ء

(۲۳)-حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ- شخصیت و حکمت کا ایک تعارف،شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل،ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،۲۰۰۱ء

(۲۴)- Organisation Of Government Under The Prophet, Idarah-i-Adabiyat-i-Dilli,1987; Islamic Publications,Shah Alam Market, Lahore, Pakistan 1988

(۲۵)-دو سو سے زائد مقالات و مضامین